خطباتِ فقیر

جلد انتالیس

- عشقِ الٰہی کی ایک دوکان
- ذکر کی محنت ضروری ہے
- علم نافع کا حاصل تقویٰ اور توکل
- کیفیات کی حفاظت
- دعاؤں کی قبولیت
- تعمیرِ مسجد کی اہمیت
- پانچ انمول باتیں

پیرِ طریقت، رہبرِ شریعت، مفکرِ اسلام

محبوب العلماء والصلحاء حضرت مولانا

پیر ذوالفقار احمد نقشبندی مجددی مدظلہم

مکتبۃ الفقیر

خطباتِ فقیر

39

پیر ذوالفقار احمد نقشبندی مجددی مدظلہم

از افادات

محبوب العلماء والصلحاء

حضرت مولانا پیر ذوالفقار احمد نقشبندی

مجددی مدظلہم

ڈاکٹر شاہد محمود نقشبندی غفرلہ

مکتبۃ الفقیر

223 سنت پورہ فیصل آباد

041-2618003

نام کتاب ——— خطبات فقیر (39)

از افادات ——— حضرت مولانا پیر ذوالفقار احمد نقشبندی مدظلہ

مرتب ——— ڈاکٹر شاہد محمود نقشبندی

کمپیوٹر کمپوزنگ ——— ڈاکٹر شاہد محمود نقشبندی

زیر سرپرستی

پروف ریڈنگ ——— مولانا مفتی عبدالنصیر صاحب
معہد الفقیر الاسلامی جھنگ

اشاعت اوّل ——— اکتوبر 2012ء

اشاعت دوم ——— مارچ 2013ء

تعداد ——— 1100

ناشر

مکتبۃ الفقیر

223 سنت پورہ فیصل آباد
041-2618003,041-2649680
0300-9652292,0322-8669680
E-Mail : Alfaqeerfsd@yahoo.com

بسم الله الرحمن الرحيم

صفحہ نمبر	عنوانات

صفحہ نمبر	عنوانات

صفحہ نمبر	عنوانات

صفحہ نمبر	عنوانات

صفحہ نمبر	عنوانات
90	...... (۲) انفسی معبود
91	...... ایمانِ کامل کے لیے معبودانِ باطلہ کی نفی ضروری ہے
91	...... معبودانِ باطلہ کی نفی کا طریقہ
92	...... نفی کامل کی محنت
93	...... حقیقتِ ابراہیمی اور حقیقتِ محمدی میں فرق
94	...... سیدنا ابراہیم علیہ السلام کا کمالِ نفی
95	...... حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کا کمالِ نفی واثبات
96	...... کلمہ طیبہ کی کثرت سے دل کی صفائی
96	...... زندگی کا رخ بدلنے کی ضرورت
98	...... گناہ کی رسیوں سے کامل آزادی
98	...... اللہ کی سرپرستی میں آیئے
101	**۳ علمِ نافع کا حاصل......تقوای اور توکل**
103	...... دین اور دنیا کا دوراہا
104	...... اہلِ علم کا راستہ
104	...... علمِ نافع کیا ہے؟
105	...... علمِ نافع اور تقوای
106	...... خوف گناہوں کو چھڑوا دیتا ہے
107	...... خوف سے گناہ کیسے چھوٹتے ہیں؟
107	...... خوف کی کمی کا نتیجہ

صفحہ نمبر	عنوانات

صفحہ نمبر	عنوانات

صفحہ نمبر	عنوانات

☆☆☆☆☆

عرضِ ناشر

محبوب العلماء والصلحاء حضرت مولانا پیر ذوالفقار احمد نقشبندی مجددی دامت برکاتہم کے علوم ومعارف پر مبنی بیانات کو شائع کرنے کا یہ سلسلہ ''خطباتِ فقیر'' کے عنوان سے 1996ء بمطابق ۱۴۱۷ھ میں شروع کیا تھا اور اب یہ انتالیسویں (۳۹) جلد آپ کے ہاتھوں میں ہے۔ جس طرح شاہین کی پرواز ہر آن بلند سے بلند تر اور فزوں سے فزوں تر ہوتی چلی جاتی ہے، کچھ یہی حال حضرت دامت برکاتہم کے بیاناتِ حکمت ومعرفت کا ہے۔ ان کے جس بیان کو بھی سنتے ہیں، ایک نئی پروازِ فکر کا آئینہ دار ہوتا ہے۔ یہ کوئی پیشہ ورانہ خطابت یا یاد کی ہوئی تقریریں نہیں ہیں، بلکہ حضرت کے دل کا سوز اور روح کا گداز ہے، جو الفاظ کے سانچے میں ڈھل کر آپ تک پہنچ رہا ہوتا ہے۔ بقولِ شاعر:

میری نوائے پریشاں کو شاعری نہ سمجھ
کہ میں ہوں محرمِ رازِ درونِ خانہ

چونکہ یہ صاحبِ دل کی بات ہوتی ہے اس لیے دلوں میں اثر کرتی ہے۔ چنانچہ حضرت کے بیانات کو ایک قبولیتِ عامہ حاصل ہے۔ حضرت کے بیانات سے علما بھی مستفید ہوتے ہیں، عوام بھی مستفید ہوتے ہیں۔ بڑے بھی رہنمائی حاصل کرتے ہیں، چھوٹے بھی سبق حاصل کرتے ہیں۔ مردوں کے دل کی دنیا بھی بدلتی

ہے، خواتین کی بھی اصلاح ہوتی ہے۔ غرض کہ ہر طبقہ کے انسان کے لیے یہ خطبات مشعلِ راہ ہیں۔

''خطباتِ فقیر'' کی اشاعت کا یہ کام ہم نے اسی نیت سے شروع کیا کہ حضرتِ اقدس دامت برکاتہم کی فکر سے سب کو فکر مند کیا جائے اور انہوں نے اپنے مشائخ سے علم وحکمت کے جو موتی اکٹھے کر کے ہم تک پہنچائے ہیں، انہیں موتیوں کی مالا بنا کر عوام تک پہنچایا جائے۔ یہ ہمارے ادارے کا ایک مشن ہے، جو ان شاء اللہ سلسلہ وار جاری رہے گا۔ قارئینِ کرام کی خدمت میں بھی گزارش ہے کہ اس مجموعۂ خطبات کو ایک عام کتاب سمجھ کر نہ پڑھا جائے، کیونکہ یہ بحرِ معرفت کے ایسے موتیوں کی مالا ہے، جن کی قدر و قیمت اہلِ دل ہی جانتے ہیں۔ یہی نہیں، بلکہ یہ صاحب خطبات کی بے مثال فصاحت و بلاغت، ذہانت و فطانت اور حلاوت و ذکاوت کا فقید المثال اظہار ہے، جس سے اہلِ ذوق حضرات کو محظوظ ہونے کا بہترین موقع ملتا ہے۔

قارئینِ کرام سے گزارش ہے کہ اشاعت کے اس کام میں کہیں کوئی کمی یا کوتاہی محسوس ہو یا اس کی بہتری کے لیے تجاویز رکھتے ہوں تو مطلع فرما کر عنداللہ ماجور ہوں۔ اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ ہمیں تازیست اپنی رضا کی لیے یہ خدمت سر انجام دینے کی توفیق عطا فرمائیں اور اسے آخرت کے لیے صدقۂ جاریہ بنائیں۔

آمین بحرمت سید المرسلین صلی اللہ علیہ وسلم!

فقیر سیف اللہ نقشبندی

مکتبۃ الفقیر

223 سنت پورہ فیصل آباد

پیش لفظ

اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ وَ کَفٰی وَسَلَامٌ عَلٰی عِبَادِہِ الَّذِیْنَ اصْطَفٰی اَمَّا بَعْدُ!

فقیر کو جب عاجز کے شیخ مرشد عالم حضرت مولانا پیر غلام حبیب نقشبندی مجددی نوراللہ مرقدہ نے اشاعت سلسلہ کے کام کی ذمہ داری سونپی، تو ابتدا میں چند دن اپنی بے بضاعتی کے احساس کے تحت اس کام کے کرنے میں متذبذب رہا، لیکن حضرت مرشد عالم رحمۃ اللہ علیہ نے بھانپ لیا، چنانچہ فرمایا کہ بھئی! تم نے اپنی طرف سے اس کام کو نہیں کرنا، بلکہ اپنے بڑوں کا حکم پورا کرنا ہے، کیوں نہیں کرتے؟ مزید فرمایا کہ جب کبھی مجلس میں بیان کے لیے بیٹھو تو اللہ کی طرف متوجہ ہو جایا کرو، بڑوں کی نسبت تمہاری پشت پناہی کرے گی۔ چنانچہ حضرت کے حکم اور نصیحت کو پیش نظر رکھتے ہوئے بندہ نے وعظ و نصیحت اور بیانات کا سلسلہ شروع کیا۔ اللہ تعالیٰ کی مدد شاملِ حال ہوئی، حلقہ بڑھتا رہا اور الحمدللہ! شرکاء کو کافی فائدہ بھی ہوتا، کیونکہ ان کی زندگیوں میں تبدیلی عاجز خود بھی دیکھتا تھا۔ تھوڑے ہی عرصے بعد چہار اطراف سے بیانات کے لیے دعوتیں آنا شروع ہوگئیں۔ شیخ کا حکم تھا، سرتابی کی مجال کہاں؟ جب بھی دعوت ملی رختِ سفر باندھا اور عازمِ سفر ہوئے۔ اس کثرت سے اسفار ہوئے کہ بعض اوقات صبح ایک ملک، دوپہر دوسرے ملک اور رات تیسرے ملک میں ہوئی، اللہ تعالیٰ نے اپنی رحمت سے ملکوں کو محلّہ بنا دیا۔ اِس ناتواں میں یہ ہمت کہاں؟...... مگر وہ جس سے

چاہیں کام لے لیتے ہیں۔ بقول شخصے ع

''قدم یہ اٹھتے نہیں، اٹھوائے جاتے ہیں''

حقیقت یہ ہے کہ یہ میرے شیخ کی دعا ہے اور اکابر کا فیض ہے جو کام کر رہا ہے، وَ اَمَّا بِنِعْمَةِ رَبِّكَ فَحَدِّثْ ۔

بیانات کی افادیت کو دیکھتے ہوئے کچھ عرصے بعد جماعت کے کچھ دوستوں نے ان کو کتابی شکل میں مرتب کرنے کا سلسلہ شروع کیا، ''مکتبۃ الفقیر'' نے اس کی اشاعت کی ذمہ داری اٹھائی، یوں ''خطبات فقیر'' کے عنوان سے نمبروار یہ ایک سلسلہ چل پڑا۔ یہ عاجز کئی ایسی جگہوں پر بھی گیا جہاں یہ خطبات پہلے پہنچے ہوئے تھے اور وہاں علماء وطلبا نے کافی پسندیدگی کا اظہار کیا۔

ان خطبات کے مطالعے میں ایک بات یہ بھی پیش نظر رکھیں کہ یہ کوئی با قاعدہ تصنیف نہیں ہے، بلکہ بیانات کا مجموعہ ہے، ان میں علمی غلطی یا بھول کا امکان موجود ہوتا ہے۔ اس لیے معزز علمائے کرام سے گزارش ہے کہ جہاں کہیں کوئی غلطی دیکھیں تو اصلاح فرما کر عند اللہ ماجور ہوں۔ دعا ہے کہ جو حضرات بھی ان بیانات کی ترتیب و اشاعت میں کوشاں ہیں، اللہ تعالیٰ ان سب کی کوششوں کو شرف قبولیت عطا فرمائیں اور انہیں اپنی رضا، اپنی لقا اور اپنا مشاہدہ نصیب فرمائیں اور عاجز کو بھی مرتے دم تک اپنے دین کی خدمت کے لیے قبول فرمائیں۔ آمین ثم آمین!

دعا گو و دعا جو

فقیر ذوالفقار احمد نقشبندی مجددی

کان اللہ لہ عوضا عن کل شیء

عرضِ مرتب

یہ خطبات مجموعہ ہے باغِ علی رضی اللہ عنہ (حضرت مرشدِ عالم رحمۃ اللہ علیہ) کے ایک پھول، عشقِ صدیق رضی اللہ عنہ کو دل میں بسا کر مشرب نقشبندیہ سے سیراب ہونے والی اور فنا فی الرسول صلی اللہ علیہ وسلم کی منزل سے گزر کر فنا فی اللہ کا راز پانے والی ایک ہستی کے بیانات کا۔ جو نسبت کا نور دل میں لیے قریہ بہ قریہ قلوبِ انسانی کو محبت الٰہی سے گرمانے اور انہیں شریعت وسنت کی راہ پر لانے میں اپنے شب و روز ایک کیے ہوئے ہے۔ بلاشبہ پوری دنیا میں لاکھوں لوگ اس چشمۂ فیض سے سیراب ہو رہے ہیں اور بعض سرشار ہو رہے ہیں کہ

لطافتِ غمِ جاں سما گئی دل میں
نزاکتِ دلِ عاشق کو پالیا میں نے

حضرت اقدس محبوب العلما والصلحا حضرت مولانا پیر ذوالفقار احمد نقشبندی دامت برکاتہم کی ذاتِ گرامی کسی تعارف کی محتاج نہیں۔ آپ کے دعوتِ رشد و ہدایت کے سفر کی ابتدا خانقاہِ عالیہ نقشبندیہ چکوال سے ہوتی ہے، جہاں انہیں مرشدِ عالم حضرت مولانا پیر غلام حبیب رحمۃ اللہ علیہ نے اجازت وخلافت کی نعمت سے شرف یاب فرمایا۔ عاجز کو حضرت اقدس مدظلہ سے بیعت ہونے کا شرف اس وقت حاصل ہوا

جب حضرت مرشد عالم رحمۃ اللہ علیہ ابھی حیات تھے۔ حضرت کا بیان اس وقت بھی اتنا پرتاثیر ہوتا تھا کہ خانقاہِ عالیہ نقشبندیہ چکوال کے سالانہ اجتماع میں مختلف شہروں سے آنے والے احباب کو حضرت کے بیان کا خاص طور پر انتظار رہتا تھا۔ بعد ازاں حضرت دامت برکاتہم نے جھنگ میں دعوت وارشاد کا سلسلہ شروع کیا جو بہت جلد دوسرے شہروں میں پھیل گیا۔ چنانچہ فیصل آباد، لاہور، کراچی، اسلام آباد، گوجرانوالہ اور بنوں وغیرہ میں مستقل بیانات ہونے لگے اور یہ سلسلہ روز بروز پھیلتا چلا گیا

ے راستے کھلتے گئے عزمِ سفر کے سامنے
منزلیں ہی منزلیں ہیں اب نظر کے سامنے

بیرون ملک سے دعوتیں ملنا شروع ہوئیں۔ امریکہ کی بہت سی ریاستوں میں مستقل بیانات ہونے لگے۔ پھر روس کی آزاد ریاستوں کے دورے ہوئے۔ متعدد یورپی ممالک میں جانا ہوا، آسٹریلیا اور پھر افریقی ممالک کی باری آئی، جہاں اب بھی رمضان المبارک میں اعتکاف اور تربیتی اجتماعات کا سلسلہ چل رہا ہے۔ برصغیر میں بنگلہ دیش، نیپال اور انڈیا میں جانا ہوا۔ انڈیا کے اسفار میں کثیر تعداد میں لوگ فیض یاب ہوئے، اور علما کی بڑی تعداد نے آپ سے روحانی استفادہ کے لیے رجوع کیا۔ مشرق بعید کے ممالک ملائشیا اور سنگاپور وغیرہ بھی جانا ہوا۔ مشرق وسطیٰ میں عرب امارات، شام، اردن اور مصر جیسے ممالک اور پھر ترکی اور لیبیا میں بھی جانا ہوا اور اس کے ساتھ ساتھ حجازِ مقدس کی طرف حج وعمرے کے اسفار تواتر سے ہوتے رہے۔ ارضِ حرمین شریفین جہاں پر پورے عالمِ اسلام سے عشاق کھنچے چلے آتے ہیں، وہاں پر زائرین میں آپ کے بیانات کا ایک مستقل سلسلہ چلتا رہتا ہے۔ یوں اس مرکزِ فیض سے آپ کا فیض اطراف واکناف میں پھیل رہا ہے۔ سالانہ تربیتی نقشبندی اجتماع

معہد الفقیر الاسلامی جھنگ میں ہوتا ہے۔ جہاں پر اندرون ملک اور بیرون ملک سے حضرت کے متوسلین کی کثیر تعداد جوق در جوق شریک ہوتی ہے۔ اس موقع پر حضرت کے خصوصی تربیتی بیانات ہوتے ہیں۔ جس کے حاضرین پر عجیب اثرات اور قابلِ دید کیفیات ہوتی ہیں۔ بقولِ شاعر ؎

؎ خود بخود کھلتے چلے جاتے ہیں رازِ حسن و عشق
اہلِ دل ، اہلِ جنوں ، اہلِ نظر کے سامنے

اللہ تعالیٰ نے حضرتِ اقدس مدظلہ کو بیان کا ایک عجیب ملکہ عطا فرمایا ہے۔ حکمت کا گویا ایک دریا ہے جو بہہ رہا ہوتا ہے، جس سے ہر شعبہ ہائے زندگی کے لوگ بہرہ مند ہوتے ہیں۔ جہاں بھی جاتے ہیں محبتِ الٰہی ،توبہ، انابت الی اللہ اور اصلاحی و تربیتی موضوعات پر بات ہوتی ہے۔ بقول

ع جہاں جاتے ہیں ہم تیرا فسانہ چھیڑ دیتے ہیں

عجیب بات تو یہ ہے کہ ابتدا میں حضرت بیانات کی ریکارڈنگ سے سختی سے منع فرما دیتے تھے کہ تشہیر کو ناپسند فرماتے تھے۔ لیکن کس کس کو کب تک روکتے؟ اہلِ شوق اتنے تھے کہ آخر ریکارڈنگ ہونا شروع ہوگئی اور لاتعداد کیسٹیں بننے لگیں۔ آڈیو سی ڈیز کا دور آیا تو سی ڈیز والیم بھی بننے لگے۔ تاہم جو مقبولیت ''خطباتِ فقیر'' کو ملی وہ اپنی مثال آپ ہے۔ عوام الناس سے زیادہ یہ خطبات علمائے کرام میں مقبول ہو رہے ہیں کیونکہ انہیں ان میں سے علم و حکمت پر مبنی پر تاثیر مواد میسر آ جاتا ہے۔ اس طرح وہ بالواسطہ طور پر حضرت کے فیض کو آگے پہنچانے کا ذریعہ بن جاتے ہیں۔

اللہ تعالیٰ جس قدر کام میرے حضرت سے لے رہے ہیں اور جس قدر عوام و خواص کا رجوع ان کی طرف ہو رہا ہے، اس کو دیکھ کر جہاں خوشی ہے وہاں یہ فکر بھی

لاحق ہو رہی ہے کہ کہیں ''یَدْخُلُوْنَ فِیْ دِیْنِ اللّٰہِ أَفْوَاجًا'' کا ناقوس تو نہیں بج رہا۔ ہائے افسوس کہ ہم کس قدر وقت ضائع کرنے والے ہیں......!!! اللہ تعالیٰ ہمیں حضرت کی زندگی میں ان کی قدر کرنے کی اور ان سے خوب خوب استفادہ کرنے کی توفیق عطا فرمادیں۔ آمین ثم آمین

مجھے بے فکر کر دے گردشِ ایام سے پہلے
پلا نظروں سے بھی کچھ، بادۂ گلفام سے پہلے

دعاؤں کا طالب
ڈاکٹر شاہد محمود نقشبندی غفرلہ

یکے از خدّام
محبوب العلماء والصلحا حضرت مولانا پیر ذوالفقار احمد نقشبندی مجددی دامت برکاتہم

﴿وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اَشَدُّ حُبًّا لِّلّٰهِ﴾ (البقرۃ:۱۶۵)

عشق الٰہی کی ایک دکان

بیان: محبوب العلما والصلحا، زبدۃ السالکین، سراج العارفین
حضرت مولانا پیر ذوالفقار احمد نقشبندی مجددی دامت برکاتہم

تاریخ: 26 مارچ 2012ء بروز اتوار ۲ جمادی الاول ۱۴۳۳ھ

موقع: سالانہ اجتماع مسکین پور شریف

مقام: خانقاہِ عالیہ نقشبندیہ فضلیہ مسکین پور شریف

اقتباس

یہ محبت دل میں کیسے پیدا ہوتی ہے اور کیسے بڑھتی ہے؟ اس کے لیے کچھ جگہیں ہوتی ہیں جن کو خانقاہیں کہا جاتا ہے۔ اللہ والوں کی جو جگہیں ہوتی ہیں، یہ محبتِ الٰہی کی دکانیں ہوتی ہیں۔ چنانچہ شاہ آفاق رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت مولانا مونگیری رحمۃ اللہ علیہ سے یہ پوچھا: مولانا! تم نے کبھی عشق کی دکان دیکھی ہے؟ مولانا تھوڑی دیر سوچتے رہے، پھر کہنے لگے: حضرت! میں نے عشق کی دو دکانیں دیکھی ہیں۔ پوچھا: کون سی؟ کہنے لگے: ایک شاہ آفاق رحمۃ اللہ علیہ کی اور ایک شاہ غلام علی دہلوی رحمۃ اللہ علیہ کی۔ اللہ والوں کی جگہیں عشق کی دکانیں ہوتی ہیں۔ یہ سودا دنیا کے بازاروں سے نہیں ملتا، اللہ والوں کے پاس ہوتا ہے۔

(حضرت مولانا پیر ذوالفقار احمد نقشبندی مجددی مدظلہ)

عشق الٰہی کی ایک دکان

اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ وَ كَفٰى وَسَلَامٌ عَلٰى عِبَادِهِ الَّذِيْنَ اصْطَفٰى اَمَّا بَعْدُ:
فَاَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطٰنِ الرَّجِيْمِ o بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ o
﴿وَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا اَشَدُّ حُبًّا لِّلّٰهِ﴾ (البقرة:۱۶۵)
سُبْحَانَ رَبِّكَ رَبِّ الْعِزَّةِ عَمَّا يَصِفُوْنَ o وَسَلَامٌ عَلَى الْمُرْسَلِيْنَ o
وَالْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ o
اَللّٰهُمَّ صَلِّ عَلٰى سَيِّدِنَا مُحَمَّدٍ وَّعَلٰى اٰلِ سَيِّدِنَا مُحَمَّدٍ وَّبَارِكْ وَسَلِّمْ

دل کا کام محبت کرنا:

انسان مختلف اعضا کا مجموعہ ہے اور ہر عضو کا اپنا کام ہے۔

......آنکھ کا کام دیکھنا

......زبان کا کام بولنا

......کان کا کام سننا

......دماغ کا کام سوچنا

......اور دل کا کام محبت کرنا ہے۔

دل بحرِ محبت ہے محبت یہ کرے گا
لاکھ اس کو بچا تو یہ کسی پہ تو مرے گا

یہ ممکن ہی نہیں کہ کوئی انسان یہ کہے کہ مجھے کسی سے محبت نہیں ۔

پتھر سے ہو خدا سے ہو یا پھر کسی سے ہو
آتا نہیں ہے چین محبت کیے بغیر

انسان کا دل محبت کیے بغیر رہ ہی نہیں سکتا۔

محبت کس سے ہو؟

محبت میں یا تو صرف اللہ رب العزت کی سچی محبت ہوگی یا پھر ماسوا کی جھوٹی موٹی محبتیں ہوگی۔اس کی مثال یوں سمجھ لیجیے! کہ جیسے ایک کمرے میں یا تو روشنی ہوگی اور اگر روشنی نہ ہوئی تو اندھیرا ضرور ہوگا۔اسی طرح انسان کے دل میں یا تو اللہ رب العزت کی محبت کی روشنی ہوگی یا نفسانی، شیطانی، شہوانی محبتوں کا اندھیرا ہوگا۔محبت کرنا دل کی صفت ہے، اب یہ بندے پر منحصر ہے کہ وہ خالق کو اپنا محبوب بنائے یا مخلوق سے دل لگائے۔یہ Choice (انتخاب) بندے کا اپنا ہے۔اور سمجھیں تو یہ سودا بہت آسان ہے، مگر افسوس کہ دنیا کی رنگینیوں میں لگ کر ہم اکثر غلط سودا کر بیٹھتے ہیں۔

دل ایک ہے اور ایک ہی کے لیے ہے:

اللہ نے دل کو بنایا ہی اپنے لیے ہے۔حضرت مرشدِ عالم رحمۃ اللہ علیہ فرماتے تھے: ''دل ایک ہے اور ایک ہی کے لیے ہے''۔اللہ تعالیٰ دل کے بیوپاری ہیں۔بندے سے دل مانگتے ہیں۔فرمایا:

﴿يَوْمَ لَا يَنْفَعُ مَالٌ وَّ لَا بَنُوْنَ ○ اِلَّا مَنْ اَتَى اللّٰهَ بِقَلْبٍ سَلِيْمٍ ○﴾
(الشعراء:۸۸،۸۹)

''قیامت کے دن نہ مال کام آئے گا نہ اولاد کام آئے گی، جو سنورا ہوا دل لایا

وہ دل اسے کام آئے گا۔''

اس لیے حدیث شریف میں فرمایا:

((اِنَّ اللّٰہَ لَا یَنْظُرُ اِلٰی صُوَرِکُمْ وَ اَمْوَالِکُمْ وَلٰکِنْ یَّنْظُرُ اِلٰی قُلُوْبِکُمْ وَ اَعْمَالِکُمْ)) (صحیح مسلم، رقم:۴۶۵۱)

''اللہ تعالیٰ نہیں دیکھتے تمہاری شکلوں صورتوں کو، نہیں دیکھتے تمہارے مال پیسے کو وہ دیکھتے ہیں تمہارے دلوں کو اور تمہارے اعمال کو''

دل......اللہ کا گھر:

تو یہ دل اللہ رب العزت کی تجلی گاہ ہے۔ قلبِ عبداللہ عرش اللّٰہ ہے۔ ایک حدیثِ قدسی کا مفہوم ہے، نہ میں زمینوں میں سماتا ہوں، نہ آسمانوں میں سماتا ہوں میں مومن بندے کے دل میں سماجاتا ہوں۔ ؎

ارض و سماں کہاں تیری وسعت کو پا سکے
اک میرا دل ہی ہے کہ جہاں تو سما سکے

مومن بندے کا یہ دل بیت اللہ ہے، اللہ کا گھر ہے۔ قرآن مجید میں رب کریم نے ارشاد فرمایا:

﴿ اِنَّ اللّٰہَ اشْتَرٰی مِنَ الْمُؤْمِنِیْنَ اَنْفُسَھُمْ وَ اَمْوَالَھُمْ بِاَنَّ لَھُمُ الْجَنَّۃَ ﴾ (التوبۃ:۱۱۱)

''اللہ تعالیٰ نے بندے سے جنت کے بدلے میں اس کے جان اور مال کو خرید لیا ہے۔''

اس آیت کے تحت مفسرین نے عجیب نکتے لکھے ہیں۔

علمی نکتہ...... بیچنے کی بجائے خریدنے کا تذکرہ:

وہ فرماتے ہیں کہ یہ نہیں فرمایا کہ میں نے اس کی جان و مال کے بدلے جنت کو بیچ دیا۔ یہ بھی تو اندازِ کلام ہوسکتا تھا کہ جان اور مال کے بدلے میں نے جنت کو بیچ دیا۔ یہ اس لیے نہ فرمایا کہ بیچنے والے کے سامنے دو چیزیں ہوتی ہیں یا تو ضرورت کی وجہ سے چیز کو بیچتا ہے یا اسے نفع کی امید ہوتی ہے۔ دس لاکھ کی زمین خریدی تھی آج پچاس لاکھ کی بک رہی ہے چلو بیچ دیتے ہیں۔ یہ دونوں چیزیں اللہ رب العزت کے لیے ممکن نہیں۔ اللہ کے ہاں نہ کوئی ضرورت ہے نہ وہاں کسی نفع کی امید ہے۔ اللہ اس سے بلند اور برتر ذات ہے۔ پھر اللہ تعالیٰ نے سودا کیوں کیا؟ تو فرمایا کہ انہیں نہ ضرورت تھی نہ اس میں ان کا نفع تھا بلکہ وہ فرماتے ہیں کہ میرے بندے تیرے فائدے کی خاطر ہم نے تیری جان اور مال کو جنت کے بدلے میں خرید لیا۔ تو بیچنے کی بجائے خریدنے کا تذکرہ کیا۔

علمی نکتہ......دل کیوں نہ خریدا؟

اور ایک دوسرا نکتہ یہ کہ انسان کے پاس اگر ایسی قیمتی چیزیں تھیں کہ جنہیں اللہ نے خرید لیا تو انسان کا دل کیوں نہ خریدا؟ دل تو اللہ کا گھر تھا اور گھر تو پہلے خریدا جاتا ہے۔ آپ غور کریں! بندے کے پاس جب وسائل ہوتے ہیں تو سب سے پہلا کام وہ یہ کرتا ہے کہ اپنے لیے گھر خریدتا ہے۔ مفسرین نے نکتہ لکھا کہ اس کی وجہ یہ ہے کہ انسان کا دل وقف کی جائیداد ہے، اللہ نے اس کو اپنے لیے وقف کرلیا اور جو وقف کی جائیداد ہوتی ہے اس کی خرید و فروخت کی اجازت نہیں ہوتی۔ فرمایا دل تو پہلے ہی میرا ہے۔ اب تمہارے پاس جان اور مال بچا تھا، وہ بھی ہم نے خرید لیے۔

اللہ کی محبت اور مخلوق کی محبت کا فرق

اللہ رب العزت کی محبت میں اور مخلوق کی محبت میں چند بنیادی فرق ہیں۔

پہلا فرق...... بے غرض محبت:

ایک بنیادی فرق یہ ہے کہ مخلوق کی محبت کے پیچھے ہمیشہ کوئی مطلب ہوتا ہے۔

مثلاً:

میاں بیوی کی محبت کو دیکھیں تو خاوند کو بیوی کی ضرورت ہے بیوی کو خاوند کی ضرورت ہے۔

- ماں باپ اولاد کی محبت میں بھی غرض شامل ہوتی ہے۔ ماں باپ سمجھتے ہیں کہ اولاد ہمارے بڑھاپے کا سہارا بنے گی اور اولاد سمجھتی ہے کہ ماں باپ ہم پر خرچ کریں گے، ہماری تربیت کریں گے اور ہم پڑھ لکھ کر، تربیت پا کر، جوان ہو جائیں گے، کسی قابل بن جائیں گے۔ تو دونوں طرف سے اغراض موجود ہیں۔
- استاد اور شاگرد کی محبت میں بھی غرض ہوتی ہے۔ تعلیمی اداروں میں جو استاد شاگرد پڑھتے پڑھاتے ہیں، شاگرد کا مقصد ہوتا ہے کہ تعلیم ملے گی، استاد کا مطلب ہوتا ہے کہ مجھے اس خدمت پر تنخواہ مل جائے گی۔
- پیر اور مرید کی محبت بھی اصل میں غرض کی محبت ہے۔ کیوں کہ مرید کی غرض ہوتی ہے کہ میں سدھر جاؤں، میں انسان بن جاؤں، میرے اندر انسانیت آجائے اور شیخ کی غرض یہ کہ اس کے بدلے اللہ مجھ سے راضی ہو جائیں گے۔ یہ بھی تو ایک غرض ہے۔

تو دنیا میں جتنی محبتیں ہیں، ہر محبت کی پیچھے غرض ہوتی ہے۔ دنیا میں اگر غرض نہیں

تو آخرت میں ضرور ہے۔صرف ایک محبت ایسی ہے جس کے پیچھے کوئی غرض مرض نہیں ہے اور وہ محبت ہے اللہ رب العزت کی محبت جو وہ بندے سے فرماتے ہیں۔ بندہ نیک بن جائے اللہ کی شان میں اضافہ نہیں ہوتا، بدکار بن جائے اس کی شان میں کمی نہیں ہوتی۔ وہ بے نیاز ذات ہے، وہ پروردگار محبت کرتا ہے تو بغیر غرض کے محبت کرتا ہے۔ اِس لیے حدیث قدسی ہے۔

''اے میرے بندے! ہر کوئی تجھ سے اپنے لیے محبت کرتا ہے میں پروردگار تجھ سے تیرے لیے محبت کرتا ہوں۔''

دوسرا فرق......محبوب خود ملاقات کے لیے بلاتا ہے:

ایک دوسرا فرق یہ ہے کہ دنیا میں ایسے ہوتا ہے کہ محبّ اپنے محبوب کو دعوت دیتا ہے کہ فلاں جگہ آؤ! ملیں گے، گھر آؤ! ملیں گے، تو محبوب کو ملاقات گاہ کی طرف بلاتے ہیں۔ اگر محبوب نہ آئے تو سمجھانے کے لیے کوئی نمائندہ بھیجتا ہے کہ محبوب کو سمجھا بجھا کر میرے پاس آنے کے لیے تیار کرو۔

اللہ تعالیٰ کی محبت اس کے بالکل برعکس ہے۔ اس محبت میں محبوبِ حقیقی خود اپنے عاشقوں کو ملاقات کے لیے بلا رہے ہیں۔ فرمایا:

﴿وَ اللّٰهُ يَدْعُوْٓا اِلٰى دَارِ السَّلٰمِ﴾ (یونس:۲۵)

''اور اللہ بلاتا ہے انہیں سلامتی کے گھر (جنت) کی طرف''

یہ جنت کیا ہے؟ ملاقات کی جگہ ہے۔ اتنا فرق ہے کہ ہم دنیا میں مہمان خانے بناتے ہیں اپنی حیثیت کے مطابق، رب کریم نے مہمان خانہ بنایا اپنی عظمت کے مطابق۔ ہم بھی کوشش کرتے ہیں کہ مہمان آئے تو اسے کھانے میں تکلیف نہ ہو، پینے میں تکلیف نہ ہو، رہنے میں تکلیف نہ ہو، مگر ہماری مجبوریاں ہوتی ہیں، وسائل کی کمی

ہوتی ہے۔ اللہ تعالیٰ تو اللہ تعالیٰ ہیں۔ رب کریم نے فرمایا میرے بندے! میں نے جنت بنا دی، اس میں تم نے آ کر رہنا ہے۔

﴿وَلَكُمْ فِيهَا مَا تَشْتَهِي أَنْفُسُكُمْ﴾ (فصلت:۳۱)

''جو تمہارے دل میں خواہش پیدا ہوگی وہ تمہیں اس میں ملے گی''

یہ اس پروردگار کی مہمان نوازی ہے۔

کبھی ایسا نہیں ہوتا کہ مہمان کو تو مہمان خانے میں بلایا جائے لیکن میزبان اس سے ملاقات نہ کرے۔ اس لیے جنت سے اس لیے محبت رکھنا کہ اس میں حوریں ہوں گی، باغ ہوں گے، یہ معمولی درجے کی سوچ ہے۔ مہمان خانے سے محبت کرنا مطلوب نہیں اصل مقصود تو میزبان کی ملاقات ہے۔ اس لیے مومن کا جنت میں جانے کا اصل مقصد اللہ رب العزت کا دیدار ہے، باقی چیزیں تو اس کے لوازمات میں سے ہیں۔

دیدارِ الٰہی......مومن کا بنیادی مقصد:

پھر حدیثِ قدسی میں فرمایا کہ میرے بندے! میں نے تمہیں ملاقات گاہ کی طرف بلایا اور تو نے میرے پیغام کو سن کر غفلت کی۔ میں نے اپنے انبیا کو بھیجا کہ تمہیں سمجھا بجھا کر مجھ سے ملاقات کرنے کے لیے تیار کر دیں۔ اللہ نے انبیا کو بھیجا کہ جاؤ، میرے بندوں کو سمجھاؤ! میں ان کو اپنی ملاقات کی لیے بلا رہا ہوں اور یہ دنیا کی رنگینیوں میں الجھے ہوئے ہیں۔ ان کی سمجھ کام نہیں کرتی، ان کو بتاؤ کہ ان کی زندگی کا مقصد کیا ہے؟ چنانچہ انبیائے کرام نے آ کر بندوں کو سمجھایا کہ اللہ رب العزت کا دیدار نصیب ہونا یہ مومن کی زندگی کا بنیادی مقصد ہے۔

دیدار کی مشق:

اسی لیے اس دنیا میں اس دیدار کی مشق کروائی گئی۔ جس کام کی بندہ مشق کرتا ہے وہ کام کرنا آسان ہو جاتا ہے۔ آپ نے اگر کار کی ڈرائیونگ نہ کی ہو تو پہلے دن سیٹ پر بیٹھیں گے تو آپ کو گاڑی چلانے میں بھی مشکل پیش آئے گی، لیکن پہلے سے پریکٹس ہو تو آرام سے گاڑی کو چلاتے جائیں گے۔ تو رب کریم نے فرمایا کہ تم دنیا میں میرے اس دیدار کا تصور کرو! یا اللہ! کیسے تصور کریں؟ فرمایا: دن میں پانچ مرتبہ ہاتھ باندھ کر کھڑے ہو جانا اور پوری نماز کے اندر بس تم میرے دیدار کا تصور کرنا۔ نماز میں اصل میں دیدار کی مشق کروائی جاتی ہے۔

دیدار کی پہل:

اور جب یہ مومن قیامت کے دن اللہ کے سامنے حاضر ہوگا تو وہاں دیدار کی پہل کروائی جائے گی۔ کیسے؟ کہ جب محبوب عظمت والا ہو، شوکت والا ہو، تو اس کا ایک رعب اور دبدبہ ہوتا ہے۔ آنکھ اٹھاتے ہوئے انسان گھبراتا ہے، آنکھ نہیں اٹھتی۔ جیسے صحابہ رضی اللہ عنہم فرماتے تھے کہ نبی علیہ الصلوٰۃ والسلام کے چہرۂ انور پر ایسا حسن و جمال ہوتا تھا کہ ہم آنکھ بھر کر نہیں دیکھ پاتے تھے۔ اب مومن جنت میں قیامت کے دن جب اللہ کے سامنے پیش ہوا تو اس کے اندر اتنی استعداد نہیں تھی کہ شروع سے ہی چہرے کی طرف دیکھے۔ اب محبوبِ حقیقی کے سامنے ہے، نظریں جھکی ہوئی ہیں، رب کریم نے فرمایا: اچھا نظر بر قدم تو ہے ہی سہی چلو میں تمہیں اپنی پنڈلی کا دیدار کروا دیتا ہوں۔ اب دیکھیے! یہ کتنی سمجھ میں آنے والی بات ہے کہ جب آنکھیں زمین پر ہی گڑی ہوئی ہیں اور محبوب پنڈلی سے اگر پردہ اٹھا دے تو اس کو دیکھنا آسان ہے۔ محبّ کو ساق کی تجلی

سے اپنی طرف متوجہ کیا۔ اسی لیے قیامت کے دن ساق کی تجلی ہوگی اور جب مومن کو اندازہ ہو جائے گا کہ اس تجلی کا لطف اور مزا کیا ہے؟ تو پھر فرمایا کہ میرے بندو! آؤ ملاقات گاہ کی طرف وہاں میں تمہیں اپنے چہرے کا دیدار عطا فرماتا ہوں۔

تیسرا فرق......مخلوق سے محبت کا انجام کار جدائی ہے:

اللہ تعالیٰ کی محبت میں اور مخلوق کی محبت میں ایک اور بھی فرق ہے کہ جو بندہ مخلوق کی محبت میں گرفتار ہوا یک نہ ایک دن اسے مخلوق سے جدا ہونا پڑے گا۔

......میاں بیوی میں محبت ہوتی ہے، موت جدا کر دیتی ہے۔

...... بھائی کو بھائی سے محبت ہوتی ہے، موت جدا کر دیتی ہے۔

......پیر اور مرید میں محبت ہوتی ہے، موت جدا کر دیتی ہے۔

حضرت خواجہ نظام الدین اولیا رحمۃ اللہ علیہ پیر تھے اور امیر خسرو مرید۔ ان کی محبت ایک مثالی محبت تھی مگر بالآخر جدا ہونا پڑا۔ حضرت نظام الدین اولیا لیٹے ہوئے ہیں، کفن اوپر ڈالا گیا، امیر خسرو نے شعر کہا: ؎

گوری سوئے سیج پر مکھ پر ڈالے کیس
چل خسرو! گھر اپنے سانج پئی سب دیس

سانج کہتے ہیں اندھیرے کو۔ خسرو! سارے جہاں میں اندھیرا نظر آتا ہے، اب تو بھی اپنے گھر چل۔ تو موت جدا کر دیتی ہے۔

سیدنا جبرائیل علیہ السلام نبی علیہ الصلوٰۃ والسلام کے پاس تشریف لائے، فرمایا: اے اللہ کے حبیب صلی اللہ علیہ وسلم!

عِشْ مَا شِئْتَ فَاِنَّكَ مَيِّتٌ

''جتنا چاہیں دنیا میں رہیں، بالآخر آپ کو موت آنی ہے۔''

وَاَحْبِبْ مَنْ اَحْبَبْتَ فَاِنَّكَ مُفَارِقُهٗ (المستدرک للحاکم:۷۹۲۱)

''جس سے چاہیں محبت کریں بالآخر آپ کو جدا ہونا پڑے گا۔''

تو ایک بنیادی فرق یہ ہے کہ جو مخلوق سے محبت کرے گا، ایک نہ ایک دن مخلوق سے جدا کر دیا جائے گا اور جو اللہ سے محبت کرے گا، ایک نا ایک دن اللہ سے ملا دیا جائے گا۔

چوتھا فرق......محبت کے نشے کا فرق:

ایک ہوتا ہے شراب کا نشہ اور ایک ہوتا ہے اللہ کی محبت کا نشہ۔ جو شراب کا نشہ ہوتا ہے وہ ترشی سے اتر جاتا ہے، مگر اللہ کی محبت کا نشہ وہ نشہ نہیں جسے ترشی اتار دے۔ یہ کچھ اور ہی چیز ہوتی ہے۔ یہ پوری زندگی کا نشہ ہوتا ہے۔ چنانچہ جن اکابرین نے محبت کے نشے کو حاصل کیا ان کی پوری زندگی اسی محبت کے نشے میں گزر گئی۔

جو شراب کے نشے میں مدہوش ہو کر گھر سے نکلے اس کے سر پر جوتے پڑتے ہیں اور جو اللہ رب العزت کی محبت کے نشے میں مدہوش ہو کر گھر سے نکلے لوگ اس کے جوتوں کو اپنے سروں پر اٹھاتے ہیں۔

بادشاہانِ وقت......عشاق کے خدام:

جو دنیا کی بادشاہ ہوتے ہیں، ان کے خدام عام نوکر چاکر ہوتے ہیں لیکن جو اللہ کی محبت کا مزا پا لیتے ہیں، اللہ تعالیٰ بادشاہانِ وقت کو ان کے خدام بنا دیتے ہیں۔

⊙......سمرقند میں ایک مرتبہ ایک عالم صاحب کہنے لگے چلیں آپ کو امیر تیمور کی قبر دکھائیں۔ ہم نے کہا بہت اچھا۔ وہ ہمیں ایک جگہ لے گئے۔ وہاں ایک مزار تھا۔ ایک

قبر اوپر تھی اور نیچے دو تین اور قبریں تھیں۔ تو میں نے ان سے پوچھا کہ بھئی! ان کی ترتیب کیا ہے؟ وہ کہنے لگے کہ جی یہ جو اوپر قبر ہے یہ امیر تیمور کے شیخ کی ہے۔ امیر تیمور کو انہوں نے دعا دی تھی کہ اللہ تجھے فاتحِ عالم بنا دے اور وہ بن گیا۔ اس نے وصیت کی تھی کہ جب مجھے دفن کیا جائے تو مجھے اس طرح رکھا جائے کہ میرا سر میرے شیخ کے قدموں کے ساتھ لگ رہا ہو۔ چنانچہ ایسا ہی کیا گیا۔ تو دنیا کے بادشاہ بھی اللہ والوں کے قدموں میں دفن ہونا سعادت سمجھتے ہیں۔

⊙......ایک دفعہ سرہند شریف جانے کی توفیق نصیب ہوئی۔ وہاں دیکھا کہ جہاں حضرت خواجہ محمد معصوم رحمۃ اللہ علیہ کا مزار ہے اس طرف ایک بڑا کھلا راستہ جا رہا ہے۔ لیکن ایک جگہ اس راستے کے بالکل درمیان میں ایک قبر ہے۔ لہٰذا یا دائیں سے ہو کر گزرنا پڑتا یا بائیں سے گزرنا پڑتا۔ بڑی عجیب سی بات لگی۔ جو وہاں کے سجادہ نشین تھے، ان سے اس عاجز نے پوچھا کہ ایسا کیوں ہے؟ قبر پہلے بنی ہوئی تھی راستہ بعد میں بنایا گیا یا راستہ پہلے تھا قبر بعد میں بنائی گئی؟ اس نے کہا کہ یہ ایک عجیب واقعہ ہے۔ افغانستان کے ایک بادشاہ تھے جو حضرت خواجہ معصوم رحمۃ اللہ علیہ سے بیعت تھے۔ انہوں نے یہ وصیت کی تھی کہ جب میری موت آجائے تو مجھے اپنے شیخ کی قبر کی طرف جانے والے راستے کی طرف دفن کیا جائے۔

یہ دنیا کے تخت و تاج کے مالک لوگ ہیں اور اللہ والوں کے قدموں میں دفن ہونا پسند کرتے ہیں۔

پانچواں فرق......محبوبِ حقیقی سے ملاقات میں معذوری نہیں:

دنیا کی محبتوں میں ہم نے یہ دیکھا کہ انسان کو معذوریاں ہوتی ہیں۔ میں ملنے نہ

آسکا فرصت نہ تھی...... میں ملنے نہ آسکا مجبوری تھی۔ تو محبوب کو ملنے کے لیے آنا پڑتا ہے۔ اور اللہ تعالیٰ کی محبت میں محبوبِ حقیقی کو آنا نہیں پڑتا ہمارے اپنے جسم میں دل ہے جو اس کا گھر ہے۔ فرمادیا:

﴿وَ هُوَ مَعَكُمْ اَيْنَمَا كُنْتُمْ﴾ (الحدید:۴)

''تم جہاں کہیں بھی ہو وہ تمہارے ساتھ ہے۔''

پنجابی کے ایک شاعر نے کہا:

کاہنوں پھرنی ایں ڈانواڈول کڑے
کیہنوں لبھنی ایں اپنے کول کڑے

وہ ہمارے پاس ہے، ہمارا دل اس کا گھر ہے۔ نہ دوری کا مسئلہ نہ معذوری کا مسئلہ، جب چاہو ملاقات ممکن ہے۔ اس لیے فرمایا: جو بندہ اللہ کی یاد میں ذکر میں بیٹھتا ہے، وہ گویا اللہ کی معیت میں ہوتا ہے۔

اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰ علیہ السلام سے فرمایا:

اَتُحِبُّ اَنْ اَسْكُنَ مَعَكَ فِيْ بَيْتِكَ يَا مُوْسٰى

اے موسیٰ! کیا آپ چاہتے ہیں کہ میں آپ کے ساتھ آپ کے گھر میں رہوں؟

موسیٰ علیہ السلام تو عاشق تھے۔

فَخَرَّ لِلّٰهِ سَاجِدًا

''سجدے میں جا گرے'' کہنے لگے:

كَيْفَ تَسْكُنُ مَعِيَ فِيْ بَيْتِيْ

''اللہ! آپ میرے ساتھ کیسے میرے گھر میں رہ سکتے ہیں؟''

رب کریم نے فرمایا:

اَنَا جَلِیْسُ مَنْ ذَکَرَنِیْ (کنز العمال:۱۸۶۵)

جو میرا ذکر کرتا ہے میں اس کا ہم نشین ہوتا ہوں۔

تو اللہ رب العزت کی محبت کا معاملہ ہی انوکھا ہے۔

محبت منعمِ حقیقی کا حق ہے:

چنانچہ اللہ رب العزت وہ ذات ہے جس نے ہمیں نعمتوں سے نوازا۔ رزق دیا، صحت دی، ایمان کی دولت عطا کی، ان گنت نعمتوں سے نوازا۔ ہم نے یہ دیکھا کہ جو لوگ چڑیا گھر وغیرہ میں درندے پالتے ہیں، تو پالنے والے اگر درندے کے پاس بھی چلے جائیں تو وہ درندہ ان کو کچھ نہیں کہتا۔ بلکہ درندے کے منہ میں بھی ہاتھ ڈال دیں تو وہ ان کو کاٹتا نہیں ہے۔ شیر کے منہ میں ہاتھ دے دیں گے، حتیٰ کے شیر کے اوپر سوار ہو کر بیٹھ جائیں گے، شیر ان کو کچھ نہیں کہے گا۔ اس کی وجہ کیا ہے؟ یہی کہ وہ سمجھتے ہیں کہ وہ شخص ان کو کھانا دیتا ہے اور کھانا ملنے کی وجہ سے درندے اس کے ممنون ہوتے ہیں، اس کا لحاظ کرتے ہیں، اس سے محبت کرتے ہیں۔ اگر درندے بھی اپنے مالک سے محبت کرتے ہیں تو انسان تو پھر انسان ہے، ہم کیوں نہ اپنے پروردگار سے محبت کریں۔ نبی علیہ الصلوٰۃ والسلام نے ارشاد فرمایا:

اَحِبُّوا اللّٰهَ لِمَا يَغْذُوْكُمْ مِّنْ نِّعَمِهٖ وَ اَحِبُّوْنِیْ بِحُبِّ اللّٰهِ

(سنن الترمذی:۳۷۸۹)

''اللہ سے محبت کرو کہ وہ تمہیں تمام نعمتیں عطا کرتا ہے اور مجھ سے محبت کرو کہ میں اللہ کا محبوب ہوں''

تو محبت حقیقت میں تو اللہ رب العزت کے لیے ہے۔ یہ اللہ تعالیٰ کا حق ہے۔

محبت کے درجات

اکابر نے لکھا کہ محبت کے چند درجات ہوتے ہیں۔

(۱) میلان:

پہلا درجہ ہے کہ انسان کا دل کسی طرف مائل ہو۔ جب طبیعت کا میلان کسی طرف ہو، اس کو رغبت کہتے ہیں کہ میرے دل میں فلاں چیز کی رغبت پیدا ہوئی۔

(۲) طلب:

پھر جب اس چیز کو حاصل کرنے کا دل کے اندر داعیہ پیدا ہو جائے، اس کیفیت کو طلب کہتے ہیں۔

(۳) محبت:

اور جب انسان اس کی طلب میں ایسا لگے کہ اس چیز کو حاصل کیے بغیر چین نہ آئے، قرار نہ آئے، تو اس کیفیت کو محبت کہتے ہیں۔

سب سے پہلے رغبت ہوتی ہے، پھر طلب ہوتی ہے اور پھر محبت ہوتی ہے۔ رب کریم نے تینوں چیزوں کو اپنے لیے پسند فرمایا۔

چنانچہ ایمان والوں نے کیا کہا:

﴿اِنَّآ اِلَى اللّٰهِ رٰغِبُوْنَ﴾ (التوبۃ:۹)

''ہم اللہ ہی کی طرف رغبت کرتے ہیں''

یعنی رغبت ہو تو اللہ کی ہو ماسوا کی طرف نہ ہو۔

طلب ہو تو اللہ رب العزت کی۔ غیر کی طلب کے بارے میں فرمایا:

﴿ضَعُفَ الطَّالِبُ وَالْمَطْلُوْبُ﴾ (الحج:۷۳)

''طلب کرنے والا اور جس کو طلب کیا جا رہا ہے، دونوں بودے اور ضعیف

ہیں‘‘

تو ہمارا مطلوبِ حقیقی کون ہے؟ اللہ تعالیٰ ہیں۔

اور محبت ہو تو فقط اللہ رب العزت کی اس لیے فرمایا:

﴿وَ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْٓا اَشَدُّ حُبًّا لِّلّٰہِ﴾ (البقرۃ:۱۶۵)

’’ایمان والوں کو اللہ سے شدید محبت ہوتی ہے‘‘

......رغبت بھی دل میں ہو تو اللہ رب العزت کی۔

......طلب بھی دل میں ہو تو اللہ رب العزت کی۔

......محبت بھی دل میں ہو تو اللہ رب العزت کی۔

محبت کی معراج:

ایک مرتبہ چند نوجوانوں سے اس عاجز نے پوچھا: بھئی! بتاؤ محبت کی معراج کیا ہے؟ کہنے لگے: کیا مطلب؟ میں نے کہا: محبّ اپنے محبوب کو سب سے قیمتی نذرانہ کیا دے سکتا ہے؟ جواب میں

کسی نے کہا: سارا مال خرچ کردے۔

کسی نے کہا: اپنی جان لٹا دے۔

سب نے جوانوں والے جواب دیے۔ پھر وہ کہنے لگے: جی آپ بتائیں! میں نے کہا: مشائخ نے لکھا ہے کہ محبت کی معراج یہ ہے کہ محبت اتنی بڑھے، اتنی بڑھے کہ محبّ بے اختیار ہو کر اپنا سر اپنے محبوب کے قدموں میں رکھ دے۔ وہ اپنے محبوب کو اپنا معبود بنا لے یہ محبت کی معراج ہے۔

اللہ رب العزت ہمارے کیا ہیں؟ معبود ہیں۔ ہم نے کلمہ پڑھتے ہوئے وعدہ کیا ہے؟ لَآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰہِ اس میں ہم اللہ سے ایک عہد کر رہے

ہوتے ہیں، ایک وعدہ کر رہے ہوتے ہیں، ایک Commitment کر رہے ہوتے ہیں کہ اے اللہ! میرے دل میں محبت کی جو انتہا ہوگی وہ فقط تیری ذات کے لیے ہو گی۔ اور اس میں اللہ تعالیٰ کسی کی شراکت کو پسند نہیں کرتے۔ اس لیے فرمایا:

وَ اِلٰهُكُمْ اِلٰهٌ وَّاحِدٌ تمہارا معبود اکیلا معبود ہے۔

میرے بندے! میں تیرے ہر گناہ کو معاف کر دوں گا لیکن اگر میری محبت میں تو کسی کو شریک بنائے گا میں یہ معاف نہیں کروں گا۔ میں غیور ہوں۔

اللہ رب العزت ہمارے معبودِ حقیقی ہیں، محبوب حقیقی ہیں، مطلوب حقیقی ہیں، ہمارا ان کے ساتھ محبت کا تعلق ہے۔

اور یہ زندگی ملی اسی لیے ہے کہ اس زندگی میں ہم اس محبت کو دل میں پیدا کریں اور اس کو بڑھائیں۔

عشقِ الٰہی کی دکانیں:

یہ محبت دل میں کیسے پیدا ہوتی ہے اور کیسے بڑھتی ہے؟ اس کے لیے کچھ جگہیں ہوتی ہیں جن کو خانقاہیں کہا جاتا ہے۔ اللہ والوں کی جو جگہیں ہوتی ہیں، یہ محبتِ الٰہی کی دکانیں ہوتی ہیں۔ چنانچہ شاہ آفاق رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت مولانا مونگیری رحمۃ اللہ علیہ سے یہ پوچھا: مولانا! تم نے کبھی عشق کی دکان دیکھی ہے؟ مولانا تھوڑی دیر سوچتے رہے، پھر کہنے لگے: حضرت! میں نے عشق کی دو دکانیں دیکھی ہیں۔ پوچھا: کون سی؟ کہنے لگے: ایک شاہ آفاق رحمۃ اللہ علیہ کی اور ایک شاہ غلام علی دہلوی رحمۃ اللہ علیہ کی۔ اللہ والوں کی جگہیں عشق کی دکانیں ہوتی ہیں۔ یہ سودا دنیا کے بازاروں سے نہیں ملتا، اللہ والوں کے پاس ہوتا ہے۔

عشقِ الٰہی کی ایک دکان......خانقاہ عالیہ فضلیہ نقشبندیہ

جس جگہ ہم بیٹھے ہیں، یہ خانقاہِ فضلیہ، یہ بھی عشق کی ایک دکان ہے۔ یہ بڑا اسٹور ہے، یہاں سے لاکھوں لوگوں نے فیض پایا۔ یہاں حضرت فضل علی قریشی رحمۃ اللہ علیہ نے اللہ کے نام پر اپنا سب کچھ قربان کیا۔ پھر اللہ نے وہ رنگ دکھایا کہ ایک دنیا اس خانقاہ سے فیض یاب ہوئی۔ اس قربانی کی بھی عجیب کہانی ہے۔

وطن سے ہجرت:

حضرت کا اصل وطن تو داؤدخیل تھا۔ دل میں خیال آیا کہ کیوں نہ بیت اللہ شریف حاضری دیں، حج کریں۔ چنانچہ خاندان کے سب لوگ، مرد عورتیں بچے، انہوں نے حج پر جانے کا ارادہ کیا۔ انہیں پتہ چلا کہ پہلے کراچی جاتے ہیں اور پھر مدینۃ الحجاج کے ذریعے جدہ جاتے ہیں۔ تو دل میں سوچا کہ جہاز والوں کی تو اپنی ترتیب ہوتی ہے تو کیوں نہ ہم اپنی ترتیب بنائیں اور نمازیں بھی پڑھیں اور آرام سکون سے سفر کریں۔ چنانچہ ایک بڑی کشتی بنوائی گئی اور اس کو دریائے سندھ کے اندر ڈالا گیا اور سفر شروع کیا گیا۔ دریائے سندھ چونکہ سمندر پر پہنچتا ہے تو اس کے ذریعے سمندر تک پہنچیں گے اور پھر وہاں سے آگے جائیں گے۔ اب یہ ایک سفر تھا:

﴿اِنِّیْ مُهَاجِرٌ اِلٰی رَبِّیْ﴾ (الحج:۲۶)

''اے اللہ! میں تیری طرف ہجرت کر رہا ہوں''

کشتی کی چوری:

چنانچہ یہاں قریب ایک مقام ہے جتوئی۔ اس کے قریب دریا کے کنارے رات

کا وقت آ گیا تو کشتی کو باندھ دیا گیا اور سب کنارے کے اوپر آ گئے کہ آرام کریں۔ اللہ رب العزت کی منشا تھی کہ رات کو کسی نے کشتی کھول دی۔ جب صبح اٹھے تو کشتی نہیں تھی۔ حیران ہو گئے کہ اب کیا کریں؟ جو ساتھ بھائی تھے وہ کہنے لگے کہ ہم تو واپس اپنے وطن داؤد خیل جائیں گے۔ حضرت خواجہ قریشی رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا کہ میں تو اللہ کے راستے میں نکل پڑا ہوں، اب اگر کشتی چلی گئی ہے تو میں واپس نہیں جاؤں گا، اسی جگہ پڑاؤ کروں گا۔ چنانچہ وہیں دریا کے کنارے آپ نے رہنا شروع کر دیا۔

بستی فقیر گڑھ اور مسکین پور کا قیام:

جو قریب دیہات کے لوگ تھے، وہ اس طرف آتے تو دیکھتے کہ بہت نیک لوگ ہیں، عورتیں پردے والی ہیں، متقی پرہیزگار ہیں، قریشی خاندان ہے اور دریا کے کنارے پر رہ رہے ہیں تو انہوں نے کچھ دنوں کے بعد آ کر کہا کہ جی آپ یہاں رہنا چاہتے ہیں تو ہمارے زمین میں آ کر رہیں۔ چنانچہ حضرت وہاں تشریف لے آئے۔ ان لوگوں نے یہاں اپنے مکان بھی بنا لیے اور اس جگہ کا نام پڑ گیا فقیر گڑھ۔ یہ پہلی بستی تھی جو بنائی۔

پھر اس کے کچھ سال کے بعد یہ جگہ جہاں ہم اس وقت بیٹھے ہیں حضرت خواجہ فضل علی قریشی رحمۃ اللہ علیہ کو زراعت کے لیے ملی۔ پھر حضرت نے اس بستی سے یہاں ہجرت فرمائی اور اس کا نام رکھا مسکین پور۔

کھیتی باڑی کا کام:

اس جگہ حضرت کھیتی باڑی کرتے تھے لیکن اللہ کی شان کہ طالبانِ محبت آتے تھے اور عشق کی پڑیا لیا کرتے تھے۔ کتابوں میں لکھا ہے کہ حضرت ہل چلا دیتے تھے اور

زمین کو برابر کرنے کے لیے جو آلہ ہوتا ہے (سہاگہ) وہ نہیں تھا، تو جو لوگ حضرت سے بیعت ہوتے تھے ان پر جذب طاری ہو جاتا تھا، تو زمین پر لیٹتے تھے جس سے زمین برابر ہو جاتی تھی۔ اس زمین سے جو گندم پیدا ہوتی تھی وہی خانقاہ میں سالکین کے لیے پورا سال کام آتی تھی۔

گندم کی پیداوار میں عجیب برکت:

ایک مرتبہ گندم کاٹی گئی اور اس کو لا کر مسجد کے صحن میں ڈال دیا گیا۔ اب صبح مشورے میں طے ہوا کہ اس کو گھر پہنچایا جائے، تاکہ وہاں جو گندم رکھنے کی جگہیں بنائی گئی ہیں ان میں ڈالا جائے۔ بہت سارے نوجوان تھے، دیہاتی لوگ تھے، انہوں نے بالٹیاں لیں اور اس کو بھرنا شروع کیا اور سر پر اٹھا اٹھا کر اندر پہنچاتے رہے۔ ظہر کا وقت ہو گیا، گندم جیسی تھی ویسی کی ویسی ہی رہی۔ حضرت خواجہ عبدالمالک صدیقی رحمۃ اللہ علیہ حضرت کے خلیفہ تھے، اللہ نے ان کو بہت عقل اور سمجھ عطا فرمائی تھی۔ اس لیے حضرت قریشی رحمۃ اللہ علیہ ان کو خلیفہ صاحب فرمایا کرتے باقی سب علما کو نام لے کر پکارتے تھے۔ تو لوگوں نے ان سے کہا کہ جی گندم اٹھا اٹھا کر گردنیں تھک گئی ہیں، گندم ختم ہونے کا نام ہی نہیں لیتی۔ تو حضرت صدیقی رحمۃ اللہ علیہ حضرت کے پاس آئے اور آ کر کہا کہ حضرت! ایک بات عرض کرنا چاہتا ہوں۔ حضرت قریشی رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا: بتاؤ! عرض کیا کہ حضرت! گندم میں جو برکت یہاں ظاہر ہو رہی ہے یہ اندر جا کر بھی تو ظاہر ہو سکتی ہے۔ بھئی! کیا مطلب؟ عرض کیا کہ صبح سے لوگ لگے ہوئے ہیں، گندم ویسی کی ویسی پڑی ہے۔ حضرت قریشی رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا: چلو میں بھی ساتھ اٹھاتا ہوں۔ جتنے لوگ تھے سب نے گندم اٹھائی اور ایک ہی وقت میں گندم صحن سے اندر پہنچ گئی۔

گندم کی پیسائی:

اب اس گندم کو پیسنے کا انتظام حضرت نے گھر میں کیا ہوا تھا۔ چکی لگائی ہوئی تھی اور یہاں گندم پیسی جاتی تھی۔ مرد گندم پیستے تھے، خود حضرت رات کے وقت گندم پیستے تھے۔ ایک طرف آپ بیٹھتے تھے ایک طرف اہلیہ صاحبہ (اماں جی) بیٹھتی تھیں، اس کام کو اتنا خفیہ کرتے تھے کہ کسی کو کان وکان خبر نہ ہو۔ ایک مرتبہ جماعت کے کسی بندے نے گندم پیسنے کے بارے میں ہلکا سا اشارہ کر دیا تو حضرت قریشی رحمۃ اللہ علیہ کو بڑا گراں گزرا، کئی دن تک تحقیق فرماتے رہے کہ بات نکلی کیسے؟ ایسے چھپا کر خدمت کیا کرتے تھے۔ جب سالکین سو جاتے تھے تو رات کے وقت حضرت خود اور اماں جی چکی چلاتے اور سالکین کے آٹے کا انتظام فرماتے۔

خانقاہ کا لنگر:

اس زمانے میں سالکین آتے جاتے رہتے تھے، باقاعدہ مطبخ کا انتظام نہیں تھا۔ ایک بندہ تھا جس کو لانگری کہا جاتا تھا مگر اس کے پاس نہ گھی ہوتا، نہ مرچیں اور مسالے، نہ پکانے کی چیزیں ہوتی تھیں۔ روزانہ کا معمول یہ تھا کہ بچھانے کے لیے دستر خوان بھی نہیں ہوتا تھا۔ جب کھانے کا وقت ہوتا تو حضرت تشریف لاتے اور دو قطاروں میں سب سالکین کو بٹھا دیا جاتا تھا، ایک ٹانگ اونچی ہوتی اور ایک ٹانگ نیچی، یعنی بیٹھنے کا جو سنت طریقہ ہے۔ اب جو ٹانگ نیچی ہوتی اس کے اوپر روٹی رکھ دی جاتی اور ہاتھ میں گڑ کی ڈلی دے دی جاتی، اس کے ساتھ روٹی کھالی جاتی۔ اور کبھی وہ گڑ کی ڈلی بھی نہیں ہوتی تھی۔ کبھی کبھی ایسا ہوتا تھا کہ سالکین جب ویرانے میں قضائے حاجت کے لیے جاتے تو وہاں پر کانٹوں والی ایک جھاڑی ہوتی تھی جس میں

سال کے کچھ خاص حصے میں چھوٹے چھوٹے پھول لگتے تھے۔ سالکین وہ پھول توڑ کر گٹھڑی سی بنا کر لے آتے۔ پکانے والے پانی میں ان پھولوں کو ڈال کر ان کو گلا لیتے تھے، نمک ہوتا تو ڈال دیتے، اسی طرح گھی ہوتا تو ڈال دیتے ورنہ بغیر گھی کے ہی ابلے ہوئے پھولوں کا سالن بنتا جسے بھتہ کہتے تھے۔ مگر جس دن بھتہ بنتا تھا سالکین خوشیاں مناتے تھے اور ایک دوسروں کے کانوں میں بتاتے تھے کہ آج بھتہ پک رہا ہے۔ یہ خوشی ہوا کرتی تھی کہ آج روٹی کے ساتھ بھتہ ملے گا۔ یہ بھی ایک نعمت ہوتی تھی۔

خانقاہ کی راتیں:

اور یہ سالکین ایسے تھے کہ جو مسجد تھی اس کے برامدے میں صحن میں رات کو سو جایا کرتے تھے۔ نہ تکیہ ہوتا تھا، نہ نیچے بچھانے کو کوئی چیز ہوتی تھی، مگر ان کی نیند بھی عجیب ہوتی تھی۔ سارے لوگ سو جاتے تھوڑی دیر گزرتی، ان میں سے کسی ایک کے اوپر جذب طاری ہو جاتا تو وہ اللہ...... اللہ...... اللہ...... یوں کہنا شروع کر دیتا، سب کی آنکھ کھل جاتی۔ پھر کچھ دیر بعد سب کی آنکھ لگتی، پھر کسی اور پر یہ حال طاری ہو جاتا۔ ساری رات یوں سوتے جاگتے گزر جاتی، مگر ان کو اس مجاہدے کے بعد اللہ کی محبت نصیب ہوتی تھی۔

دو مغلوب الحال بوڑھوں کی مستی:

ان کو کیسی محبت ہوتی تھی۔ ایک دفعہ مسجد کے صحن میں دو سفید ریش بزرگ بیٹھے ہیں۔ دونوں بڑے با اخلاق اچھے انسان تھے۔ مگر اچانک ایک دوسرے سے الجھنے لگ گئے۔ ایک دوسرے کا گریبان پکڑ کر جھنجھوڑتا پھر دوسرا اس کا گریبان پکڑ کر جھنجھوڑتا، اب دونوں ایک دوسرے کے ساتھ مسجد کے صحن میں ایسا کر رہے ہیں۔

دیکھنے والے حیران تھے کہ نیک صوفی صافی، اللہ توبہ کرنے والے بندے ہیں مگر ایک دوسرے سے کیوں الجھ رہے ہیں؟ ایک گریبان سے پکڑ کر دوسرے کو دھپی لگاتا دوسرا اس کو دھپی لگا دیتا۔

جب حقیقتِ حال معلوم ہوئی تو بات بڑی عجیب تھی۔ اصل میں دونوں بیٹھے کوئی بات کر رہے تھے کہ اس بات کے درمیان میں ان میں سے ایک نے کہہ دیا ''اللہ میڈا ہے'' اب دوسرے سے یہ بات برداشت نہیں ہوئی، اس نے اس کا گریبان پکڑ کر کہا: نہیں! اللہ میڈا ہے۔ پھر اس نے اس کا گریبان پکڑ کر کہا: نہیں! اللہ میڈا ہے۔ دونوں مغلوب الحال تھے۔ اللہ کی محبت کا نشہ ایسا تھا! کہ وہ آپس میں جھگڑ پڑے۔ کیا محبت کے صاغر تقسیم ہوتے ہوں گے۔

توحید کی مے صاغر سے نہیں آنکھوں سے پلائی جاتی ہے

اکابرین کی فیضیابی:

حضرت قریشی رحمۃ اللہ علیہ آنکھوں سے یہ نعمت پلایا کرتے تھے۔ لوگ جام پر جام لنڈھاتے تھے۔ یہی تو وجہ تھی کہ مفتی اعظم ہند رحمۃ اللہ علیہ، حضرت مفتی کفایت اللہ رحمۃ اللہ علیہ جیسی شخصیتیں بھی اسی خانقاہ کے اندر آکر کچھ عرصہ قیام پذیر رہیں۔ اللہ کی محبت پانے کے لیے حضرت لاہوری رحمۃ اللہ علیہ تشریف لائے۔ اور بڑے بڑے اکابرین آتے رہے۔ وجہ کیا تھی؟ یہی کہ اللہ کی محبت ملا کرتی تھی۔ اور واقعی ہم سب اس کے محتاج ہیں۔

ایک عاشق صادق کی حضرت قریشی رحمۃ اللہ علیہ سے محبت:

ان خدام میں حضرت قریشی رحمۃ اللہ علیہ کا ایک عاشق صادق بھی تھا، کچھ بندے

ہوتے ہیں اللہ ان کو خاص جذبہ دے دیتے ہیں۔اس کے کچھ واقعات حضرت مرشد عالم رحمۃ اللہ علیہ نے سنائے جواب میں آپ کی خدمت میں عرض کروں گا۔

⊙......فرمانے لگے: وہ جو عاشق صادق تھا وہ تو حضرت پر بہت قربان ہوتا تھا۔ایک مرتبہ حضرت قریشی رحمۃ اللہ علیہ نے بیٹھے بیٹھے موت کے عنوان پر گفتگو شروع کر دی۔فقیرو! دنیا فانی ہے......ہم نے مرنا ہے...... یہاں سے جانا ہے۔تو جب حضرت نے دو تین دفعہ مرنے مرنے کا نام لیا تو اس عاشق صادق سے برداشت نہ ہوا۔فرماتے ہیں کہ ہم نے دیکھا کہ وہ مجلس میں اٹھ کر آیا اور آ کر حضرت کے منہ پر ہاتھ رکھ کر کہنے لگا: ’’چپ کر پیرا کی مرن مرن لایا ہویا اے‘‘ (خاموش ہو جائیں کیوں بار بار مرنے کی بات کر رہے ہیں؟) حضرت فرماتے ہیں کہ میں خود وہاں موجود تھا اور یہ بات سنی۔

⊙......ایک دفعہ یہاں مسجد میں یہی مجذوب آدمی حضرت کے پاس آیا، کہنے لگا: حضرت! حضرت! سانپ آ رہا ہے پکڑ کر لے آؤں؟ پورا مجمع حیران ہے، حضرت قریشی رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا: ہاں لے آؤ! وہ بھاگا گیا اور جس طرف جوتے پڑے تھے وہاں سے اتنا بڑا دو گز کا سانپ پکڑ کر لے آیا۔جیسے کوئی رسی اٹھا کر لے آتے ہیں۔پھر قریب آ کر کہتا ہے: حضرت! اسے مار دوں یا چھوڑ دوں؟ حضرت نے فرمایا: بھئی! دور جا کر چھوڑ دو۔وہ دور جا کر چھوڑ کر آ گیا۔اللہ کی محبت میں مست ایسے لوگ ہوتے تھے۔

⊙......ایک مرتبہ اس عاشق صادق نے اپنے گھر میں بیوی کو کہا ہوا تھا کہ گاؤں میں جہاں سے تمہیں خالص چھوٹی مکھی کا شہد ملے وہ خرید لینا، اکھٹا کر لینا، میں نے اپنے حضرت کو تحفہ دینا ہے۔چنانچہ اس کی بیوی کو جہاں پتہ چلتا کہ فلاں جگہ شہد ہے، وہ خرید لیتی، ایک مٹکے میں وہ شہد بھر گیا۔وہ اپنے گھر سے لے کر چلا کہ میں اپنے شیخ کی

خدمت میں ہدیہ اور تحفہ دیتا ہوں۔ اللہ کی شان کہ حضرت فضل قریشی رحمۃ اللہ علیہ مسجد کے کمرے میں تشریف فرما تھے، وہ عاشق صادق آیا اور جیسے ہی برآمدے سے اندر داخل ہوا اور شیخ پر نظر پڑی تو اب اپنے آپ پر قابو نہ رکھ سکا اور جذب میں آکر اس کا توازن بگڑ گیا۔ توازن خراب ہونے سے سر پر رکھا مٹکا سارا نیچے مسجد کے فرش پر آن پڑا اور شہد پھیل گیا۔ اب وہ تو جذب میں اللہ اللہ کر رہا ہے۔ حضرت قریشی رحمۃ اللہ علیہ مسکرا کر فرماتے ہیں: ؎

گھڑے بھرن سہیلیاں رنگ رنگ دے گھڑے
بھریا اوہدا جانڑیے جیہدا توڑ چڑھے

⊙......ایک مرتبہ حضرت قریشی رحمۃ اللہ علیہ تبلیغ کے سفر میں نکلے تو پتہ چلا کہ یہاں سے ایک گاؤں بہت قریب ہے جس کا نام ہے دین پور۔ حضرت خواجہ غلام محمد دین پوری رحمۃ اللہ علیہ اس وقت حیات تھے۔ حضرت قریشی رحمۃ اللہ علیہ نے مجلس میں کہا کہ میرا دل تو بڑا چاہتا ہے کہ میں حضرت کی زیارت کروں لیکن پیر بن کر جانا مجھے اچھا نہیں لگتا، یہ ادب کی خلاف ہے۔ اس لیے میں نہیں جاتا۔ یہ بات جب حضرت خواجہ صدیقی رحمۃ اللہ علیہ نے سنی تو انہوں نے مشورہ دیا کہ حضرت! ایک مشورہ ہے۔ پوچھا کیا مشورہ ہے؟ عرض کیا آپ اپنا امامہ ان پٹھان خلفا کو دے دیں، یہ جو گورے چٹے منور چہرے والے ہیں۔ اور واسکٹ کسی اور کو پہنا دیں اور اپنا اعصا کسی اور کو دے دیں۔ خود سادہ ٹوپی اور معمولی لباس پہن لیں اور ان پٹھانوں کو آگے کر دیں کہ پیر یہ نظر آئیں۔ پھر مجمعے کے درمیان میں آرام سے چلتے ہوئے جائیں، مصافحہ بھی ہو جائے گا، زیارت بھی ہو جائے گی۔ حضرت قریشی رحمۃ اللہ علیہ کو یہ مشورہ بہت پسند آیا۔ فرمانے لگے: ٹھیک ہے چلتے ہیں۔ ایسا ہی کیا گیا۔ حضرت نے امامہ کسی کو دیا، واسکٹ دوسرے کو اور اعصا

تیسرے کو اور ان حضرت کو آگے چلایا اور حضرت درمیان میں چلے، اس طرح چلتے چلتے ہوئے یہ ساری جماعت دین پور پہنچ گئی۔

اللہ کی شان اللہ تعالیٰ اپنے پیاروں کو باتیں سمجھا دیا کرتا ہے۔ جب یہ پہنچے تو کیا دیکھا کہ حضرت خواجہ غلام محمد رحمۃ اللہ علیہ اپنی جماعت کو لے کر بستی کے کنارے پر استقبال کے لیے کھڑے ہوئے ہیں۔ کوئی اطلاع نہیں دی گئی لیکن یہ روحانی **Messages** (پیغامات) ہوتے ہیں جو اللہ دلوں سے دلوں تک پہنچا دیتا ہے۔ اور جب قریب پہنچے تو جو حضرات آگے آگے تھے انہوں نے جا کر مصافحہ کیا۔ جو مصافحہ کرتا تو حضرت خواجہ غلام محمد رحمۃ اللہ علیہ مصافحہ فرماتے اور یوں ہاتھ سے ایک طرف فرما دیتے۔ لوگ آتے گئے مصافحہ کر کے ہٹتے گئے، جب حضرت قریشی رحمۃ اللہ علیہ آئے تو خواجہ غلام محمد رحمۃ اللہ علیہ نے ان کو گلے سے لگا لیا۔ اب اس عاشق صادق پر حال پڑ گیا۔ زور زور سے اللہ...... اللہ...... اللہ کہنے لگا اور آخر پر کہتا ہے:

''تو چھپنا ویں چا ہویں او پیر! تو چھپ نہیں سکدا''

پیر صاحب! آپ چھپنا بھی چاہیں تو نہیں چھپ سکتے۔

یہ اللہ کی محبت پانے والی جماعت تھی۔ وہ مجاہدے کرتے تھے، مشقتیں اٹھاتے تھے، مگر اس کے بدلے یہاں سے بڑی دولت لے کر جاتے تھے۔ ان کے دل اللہ کی محبت سے لبریز ہو جاتے تھے۔

حضرت فضل علی قریشی رحمۃ اللہ علیہ کی طلبِ صادق:

ہمارا مقصود یہاں آنے کا اللہ کی محبت کو پانا ہے اور اس محبت کو پانے کے لیے اکابر نے بڑے سفر کیے ہیں۔ حضرت قریشی رحمۃ اللہ علیہ نے خود اس نعمت کو پانے کے لیے تقریباً دو سو یا اس سے بھی زیادہ کلومیٹر کا سفر کیا تھا۔

حضرت فرماتے ہیں کہ جب میں یہاں سے نکلتا تھا تو کوئی رفیقِ سفر ساتھ نہیں ہوتا تھا، بالکل اکیلا ہوتا تھا اور ایک ڈول میرے پاس ہوتا تھا تاکہ اگر راستے میں کہیں کنواں آ جائے تو مجھے برتن کسی سے مانگنا نہ پڑے، کسی سے کہنا نہ پڑے کہ جی پانی چاہیے۔ میں کنویں میں سے پانی ڈول کے ذریعے خود نکالوں، وضو کروں، نماز پڑھوں، پانی پی لوں۔ فرماتے تھے کہ میرے پاس چنے ہوتے تھے، صبح بھوک لگتی تو وہی کھالیتا تھا، شام بھوک لگتی تھی تو وہ کھالیتا تھا۔ کہیں راستے میں کھیت ہوتے جن میں گاجر مولی شلجم اس قسم کی سبزیاں ہوتیں، تو میں کسان سے خرید کر ان کو کھالیا کرتا تھا اور یہ پورا سفر اسی طرح گزرتا تھا۔ اور میں خوشی سے پھولا نہیں سماتا تھا کہ میں اپنے شیخ کی زیارت کے لیے حاضر ہو رہا ہوں۔ بیس دن جانے میں لگا کرتے تھے اور بیس دن آنے میں لگا کرتے تھے، چالیس دن کا تو پیدل سفر تھا اور پھر وہاں بھی کچھ عرصہ قیام فرماتے ہوں گے۔

فرماتے تھے جب میں وہاں جاتا تو میں سوچتا تھا کہ میرے پیر بھائی تو بڑے عظیم لوگ ہیں، علم والے ہیں عمل والے ہیں، یہ حضرت کی مجلس میں بیٹھیں گے تو معارف سیکھیں گے اور میں تو بس خدمت کرنے کے قابل ہی ہوں، میں حضرت کی بکریاں چراتا ہوں۔ تو حضرت خواجہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے ہاں جو بکریاں تھیں میں ان کو لے کر بکریاں چرانے چلا جاتا تھا۔ بکریاں خود بھی چرتی تھیں اور میں بھی گھاس توڑ توڑ کر ان کے منہ میں ڈالتا تھا کہ اور کھائیں۔ جب رات ہوتی تو گھاس کی گٹھڑی اپنے سر پر بھی اٹھا کر لاتا تھا کہ واپس جا کر بھی یہ بکریاں کھائیں گی۔ رات ہوتی تو میرے سارے پیر بھائی چارپائیوں پر سو جایا کرتے تھے اور میں خانقاہ میں بیٹھ کر رات گزار دیا کرتا تھا۔ میں اس لیے نہیں سوتا تھا کہ کہیں نیند میں میرے جسم سے ریح خارج ہو

اور میرے بھائیوں کو تکلیف پہنچے۔ اس لیے میں ان کے درمیان نہیں سوتا تھا۔ مسجد میں بیٹھ کر رات گزارتا تھا۔

مگر میرے شیخ بڑے نظر والے تھے، وہ مجلس میں کہتے تھے: فقیرو! میں تم سب کو غافل پاتا ہوں اور اس قریشی بچے کو میں حاضر پاتا ہوں۔ تو ہمارا بھی یہاں آنے کا بنیادی مقصد اللہ رب العزت کی محبت کو حاصل کرنا ہے۔

حضرت قریشی رحمۃ اللہ علیہ کی قبولیت:

حضرت قریشی رحمۃ اللہ علیہ ایک مرتبہ گھر تشریف لائے، لوگ آپ کی نصیحت کے منتظر تھے۔ بیٹھ کر گفتگو کا آغاز شروع کیا۔ فرمایا: ''فقیرو!'' بس اتنا کہا پھر چپ ہو گئے۔ اب لوگ حیران تھے کہ حضرت کچھ کہنا چاہتے تھے مگر کہا کچھ نہیں۔ تھوڑی دیر خاموشی رہی پھر حضرت نے فرمانا شروع کیا، ایک مرتبہ میرے پیٹ میں ہوا بہت جمع ہوگئی اور وہ پیٹ سے خارج ہی نہیں ہوتی تھی۔ میں چاہتا تھا کہ ہوا خارج ہو جائے لیکن نہیں ہو رہی تھی۔ بسا اوقات ایسی طبیعت ہو جاتی ہے، بیماری ہو جاتی ہے کہ ہوا نکلنے کا راستہ ہی بھول جاتی ہے۔ فرماتے ہیں کہ اتنی ہوا پیٹ میں بھر گئی کہ درد کی شدت کی وجہ سے میں زمین پر لیٹنے لگ گیا، لوٹ پوٹ ہونے لگا، حتیٰ کہ اتنی تکلیف تھی کہ مجھے دن میں تارے نظر آنے لگے۔ اس طرح میں لوٹ پوٹ ہو رہا تھا کہ اچانک میرے جسم سے وہ گندی ہوا نکلی اور مجھے سکون ہو گیا۔

اب سننے والے لوگ حیران تھے کہ یہ بھی کوئی بتانے کی بات ہے، یہ بات تو ایسی نہیں جو سنائی جائے۔ حضرت نے تو خوب تفصیل سے سنائی۔ یہ سنانے کے بعد پھر اگلی بات فرمائی کہ فقیرو! جو شخص اپنے پیٹ سے گندی ہوا کے نکلنے کا محتاج ہو وہ کوئی بڑا بول، بول سکتا ہے۔ پہلے اپنے نفس کو اینٹی بائیوٹک (Anti Biotic) دوا دی کہ جو

بات اصل میں سنانا چاہتے ہیں کہیں اسے سناتے ہوئے نفس میں عجب کی کیفیت پیدا نہ ہوا۔ جب یہ پوچھا کہ جو شخص اپنے پیٹ سے گندی ہوا کے نکلنے کا محتاج ہو وہ بھی کوئی بڑا بول بول سکتا ہے؟ تو لوگوں نے کہا: نہیں! وہ بڑا بول نہیں بول سکتا۔ پھر فرمایا: اچھا اب میں تمہیں بتاتا ہوں کہ آج رات مجھے خواب میں نبی ﷺ کی زیارت نصیب ہوئی اور نبی علیہ السلام نے ارشاد فرمایا: قریشی! جیسے متبع سنت لوگوں کی جماعت تو نے تیار کی ہے من حیث الجماعت اس وقت دنیا میں کہیں موجود نہیں ہے۔

مئے عشق پیتے جائیں:

یہ خانقاہِ نقشبندیہ فضلیہ وہی خانقاہ ہے۔ ارادہ تو کچھ اور مضمون کہنے کا تھا لیکن خانقاہ کے ان حالات کا بیان کرنا بھی ضروری تھا کہ ہمیں پتہ چلے کہ یہاں کون سی دولت تقسیم ہوتی رہی اور ہو رہی ہے۔ تاکہ اس کی طرف ہماری توجہ ہو۔

تو یہ عشق کی دکان ہے، یہ محبت کی دکان ہے۔ آنے والے یہاں آتے تھے اور پی کر جاتے تھے اور ان کی چہرے بتاتے تھے کہ یہ پی کر آئے ہیں۔ زندگیاں بدل جاتی تھیں۔ ہم بھی یہی مئے پینے کے لیے یہاں آئے ہیں۔ ہم یہی عشق کی پڑیا یہاں سے لینے کے لیے آئے ہیں۔ تو مئے عشق یہاں سے پی کر جائیں۔ آج ہم اس بات کو سمجھیں کہ محبت کے قابل فقط اللہ رب العزت کی ذات ہے، یہ بات اسی کو سجتی ہے کہ انسان اس سے محبت کرے۔ تو ہم اپنے دل و نگاہ کو محبوبِ حقیقی پر ٹکا دیں۔ پھر دیکھیں زندگی کا مزا۔

اللہ کو محبت، محبّ سے بھی بڑھ کر:

اللہ رب العزت کی محبت کا ایک خاص پہلو یہ بھی ہے کہ دنیا میں محبت اچھی سمجھی

جاتی ہے، جب دونوں طرف برابر کی محبت ہو۔ چنانچہ شاعر نے کہا:

الفت میں ہے مزا کہ ہوں وہ بھی بے قرار
دونوں طرف ہو آگ برابر لگی ہوئی

تو برابر کی محبت ہو تو سمجھا جاتا ہے کہ یہ محبت کی معراج ہے۔ مگر اللہ رب العزت کی محبت کا معاملہ کچھ اور ہے بندہ اپنے پروردگار سے جتنی محبت کرتا ہے۔ اللہ تعالیٰ اس بندے سے اس سے بڑھ کر محبت فرماتے ہیں۔ فرمایا: میرے بندے! تم ایک بالشت میری طرف آؤ گے، میری رحمت تمہاری طرف دو بالشت جائے گی۔

وَ اِنْ اَتَانِیْ یَمْشِیْ اَتَیْتُهٗ هَرْ وَلَةً (صحیح بخاری:۶۸۵۶)

''او میرے بندے! تو چل کر میری طرف آئے گا، میری رحمت دوڑ کر تیری طرف جائے گی۔''

اللہ رب العزت کو بندے کی بنسبت محبت زیادہ ہے۔ ہم تو اتنی محبت واقعی نہیں کر سکتے۔ یہ تو اس کریم کا کرم ہے، یہ اس مالک کا احسان ہے کہ اس نے کہا کہ مجھے اپنے بندوں سے محبت ہے۔ لہٰذا اب ہم اپنی توجہ کا قبلہ سیدھا کر لیں۔

حسنِ فانی کے پیچھے لگنا زندگی کو ضائع کرنا ہے:

یہ جو مخلوق کی نفسانی، شیطانی، شہوانی محبتیں ہیں، یہ زندگی کو ضائع کرنا ہے۔ زیب النساء مخفی نے فارسی میں شعر کہے:

مرغِ دل را گلشنِ بہتر ز کوئے یار نیست
طالبِ دیدار را ذوقِ گل و گلزار نیست

''دل کے مرغ کے لیے یار کی گلی سے بڑا گلشن کوئی نہیں ہوتا۔ جو دیدار کا طالب ہوتا ہے اس کو گل و گلزار کی چاہت نہیں رہتی۔''

گفتم از عشقِ بتاں اے دل چہ حاصل کردہ ای
گفت مارا حاصلِ جز نالہ ہائے زار نیست

''میں نے کہا: اے دل! تجھے یہ دنیا کے محبوبوں کی محبت سے کیا ملا؟ مخلوق کی محبتوں سے کیا ملا؟ اس نے کہا سوائے حسرت اور رونے دھونے کے علاوہ مجھے کچھ نہیں ملا۔''

پھر آخر پر ایک عجیب شعر کہا:

چند قطرے خونِ دل مخفی برائے مہوشاں
ریختن بر خاک و گل ایں شیوۂ عطار نیست

اے مخفی! یہ چند قطرے تو خونِ دل ہے (یعنی چھوٹا سے تو دل ہے) جو محبوبِ حقیقی کے لیے عطا ہوا اس کو مٹی کی بنی ہوئی چیزوں پر فدا کر دینا یہ عقلمندوں کا شیوا نہیں ہوا کرتا۔

کتنی عجیب بات ہے کہ پیشاب کے لوٹے کے پیچھے انسان اللہ سے جدا ہو جاتا ہے۔ مخلوق کی محبتوں کا نتیجہ کیا ہے؟ بس یہی وصل اور یہی ملاقات؟ عجیب بات ہے کہ حسن سے محبت کرتے ہیں اور جس پروردگار نے حسن دیا اس کی محبت یاد نہیں رہتی۔ یہ حسنِ ظاہر اللہ کے ہاں کوئی درجہ نہیں رکھتا۔

حسنِ ظاہر کی قیمت:

مفسرین نے ایک نکتہ لکھا ہے۔ فرماتے ہیں کہ سیدنا یوسف علیہ السلام لڑکپن کی عمر میں کنویں میں ڈالے گئے۔ اب لڑکپن کی عمر میں اگر کوئی بچہ پہلے سے ہی حسین ہو تو حسن دوبالا ہوتا ہے۔ کیونکہ وہ غنچہ کی مانند ہوتا ہے اور غنچہ کی مانند اس کا حسن اور نکھرتا ہوا ہوتا ہے۔ یوسف علیہ السلام کا حسن بھی عجیب تھا اور پھر وہ بھی لڑکپن کی عمر تو حسن کا کیا

عالم ہوگا؟ بھائیوں نے کنویں میں ڈال دیا، جب کنویں سے نکالا گیا تو سودا کر دیا گیا۔ سودا کتنے میں ہوا؟ ﴿وَ شَرَوْهُ بِثَمَنٍ بَخْسٍ دَرَاهِمَ مَعْدُوْدَةٍ﴾ ان کو چند کھوٹے سکوں کے بدلے بیچنے والوں نے بیچا، خریدنے والوں نے خریدا۔ تو مفسرین نے یہاں نکتہ لکھا کہ اللہ تعالیٰ اپنے بندوں کو Message (پیغام) دینا چاہتے تھے کہ بندو! تم حسنِ ظاہر کے پیچھے جو بھاگے پھرتے ہو یہ چند کھوٹے سکوں کی متاع ہے جس کے پیچھے تم زندگی کے سودے کرتے ہو۔

تصوف کا بنیادی مقصد:

محبت کے قابل فقط اللہ رب العزت کی ذات ہے۔ ہاں مخلوق سے محبت ہو تو اللہ رب العزت کی نسبت سے ہونی چاہیے۔ اسی لیے تصوف کا بنیادی مقصد یہ ہے کہ مخلوق سے کٹو، اللہ سے جڑو، پھر اللہ کی نسبت سے مخلوق کے ساتھ جڑو۔ اگر یہ چیز حاصل ہوگئی تو زندگی کا مقصد حاصل ہوگیا۔

دنیا کے محبوب...... بے وفا محبوب:

اللہ رب العزت محبت نبھانا جانتے ہیں۔ دنیا کے محبوب تو بے وفائی کر جاتے ہیں، وقت آنے پر جھنڈی دکھا دیتے ہیں۔ دنیا کی محبتوں میں بے وفائی کا شکوہ تو سنتے ہی رہتے ہیں۔ محبّ کہتا ہے، ادھر سے محبت نہ ملی، وہ کہتا ہے اُدھر سے محبت نہ ملی۔ کسی نے اشعار لکھے: ؎

کبھی کسی کو مکمل جہاں نہیں ملتا
زمین ملی ہے تو پھر آسمان نہیں ملتا
جسے بھی دیکھیے اپنے آپ میں گم ہے
زباں ملی ہے مگر ہم زباں نہیں ملتا

بھرے جہاں میں ممکن نہیں پیار نہ ہو
جہاں امید ہو اس کی وہاں نہیں ملتا

امیدیں لگاتے ہیں، محبت نہیں ملتی، جواب نہیں ملتا۔ خاوند کو بیوی سے، بیوی کو خاوند سے وہ جواب نہیں ملتا۔ یہ دنیا کا معاملہ ہے ہی ایسا۔

محبوبِ حقیقی کی وفا:

ایک اللہ رب العزت کی محبت ہے کہ اللہ تعالیٰ محبت کو نبھانا جانتے ہیں۔

⊙......رابعہ بصریہ رحمۃ اللہ علیہا اللہ کی نیک بندی تھیں۔ اپنے عبادت خانے کے اندر آرام کر رہی تھیں کہ ایک چور آ نکلا۔ اس نے دیکھا اور تو کوئی چیز ہے نہیں یہ ایک چادر ہے یہی اٹھا کر لے جاتا ہوں۔ اس نے چادر اٹھائی، جب اٹھ کر جانے لگا تو آنکھوں کے آگے اندھیرا آ گیا۔ جیسے چکر آ جاتا ہے۔ اب اس کو دروازہ نظر نہ آیا، وہ گھبرا گیا اور گھبرا کر اس نے چادر ہی پھینک دی۔ جب چادر پھینکی تو دروازہ اس کو نظر آنے لگا۔ وہ خوفزدہ ہو کر جب دروازے سے نکلنے لگا تو آواز آئی: ''اگر ایک دوست سویا ہوا ہے تو دوسرا دوست جاگتا ہے''۔ دیکھو! اللہ کیسے محبت نبھاتے ہیں۔ اللہ اکبر کبیرا۔

(تذکرۃ الاولیاء، ص:۱۰۱)

⊙......ایک نوجوان ہے، ان کا نام ہے بشر۔ شراب پیتے ہیں اور ایک دفعہ مدہوشی کے عالم میں جا رہے ہیں۔ اچانک نظر پڑی تو زمین کے اوپر ایک کاغذ پڑا تھا جس پر اللہ کا نام لکھا ہوا تھا۔ جب انہوں نے یہ دیکھا تو دل میں خیال آیا کہ یہ مالک الملک کا نام ہے اور زمین پر پڑا ہے، بے ادبی ہو رہی ہے۔ انہوں نے اس کو اٹھا لیا، صاف کیا اور سر کے قریب دیوار میں ایک سوراخ تھا، وہاں ڈال دیا۔ اللہ رب العزت نے وقت کے ایک ولی کو الہام فرمایا: جاؤ اور بشر حافی کو میرا یہ پیغام دے دو کہ تم نے

میرے نام کو قدموں سے لے کر سر تک اوپر اٹھایا ہے، میں پروردگار تیرے نام کو فرش سے لے کر عرش تک اوپر اٹھاتا ہوں۔

یہ پیغام ملا تو دل کی کیفیت بدل گئی، دنیا ہی بدل گئی۔ شراب چھوڑ دی نیکی اختیار کر لی اللہ کی محبت کا مزا نصیب ہونے لگ گیا، زندگی بدل گئی۔ اور پھر وقت کے بڑے بزرگوں میں سے ہوئے۔ امام احمد بن حنبل رحمۃ اللہ علیہ جیسے بڑے بڑے حضرات ان کے قدردان گزرے ہیں۔

یہ بشر حافی رحمۃ اللہ علیہ ننگے پاؤں چلا کرتے تھے، جوتے نہیں پہنتے تھے۔ اس لیے ان کو حافی کہتے ہیں، یعنی ننگے پاؤں چلنے والا۔ کسی نے پوچھا کہ آپ جوتے کیوں نہیں پہنتے؟ کہنے لگے: جب میں نے مالک الملک سے صلح کی اس وقت میں نے جوتا نہیں پہنا ہوا تھا۔ پھر بعد میں میں نے قرآن پڑھا تو رب کریم کا فرمان دیکھا: ﴿وَالْاَرْضَ فَرَشْنٰهَا﴾ زمین کو ہم نے فرش بنایا۔ اب اس شہنشاہ کے بنائے ہوئے فرش پر جوتے کے ساتھ چلتے ہوئے مجھے حیا آتی ہے۔ یہ میرے مالک کا فرش ہے، اس لیے اس پر ننگے پاؤں چلتا ہوں۔ خیر یہ ان کا ایک انفرادی عمل تھا۔

(تذکرۃ الاولیاء، ص:۱۵۲۔۱۵۱ ، کشف المحجوب)

تذکرۃ الاولیاء میں یہ واقعہ لکھا ہے کہ ایک آدمی تھا جو اس بستی میں رہتا تھا اور گدھے کے اوپر سامان لاتا لے جاتا تھا۔ ایک دن وہ سامان لا رہا تھا کہ اس کے گدھے نے راستے کے درمیان میں لید کر دی۔ وہ گدھے والا رونے لگ گیا۔ لوگوں نے پوچھا: روتے کیوں ہو؟ کہنے لگا کہ مجھے لگتا ہے بشر حافی فوت ہو گئے۔ جب پتہ کیا تو واقعی بشر حافی فوت ہو چکے تھے۔ تو لوگوں نے اس سے پوچھا کہ بھئی! تجھے کیسے اندازہ ہوا؟ وہ کہنے لگا: جب سے اس اللہ کے بندے نے زمین پر ننگے پاؤں چلنا

شروع کیا، میں اپنی گدھا ریڑھی کو چلاتا تھا تو دیکھتا تھا کہ جب گدھے کو پیشاب پاخانے کی ضرورت ہوتی، یہ ہمیشہ سڑک کے کنارے آجاتا تھا، راستے کا درمیان کا حصہ پاک رہتا تھا۔ اللہ تعالیٰ نے راستے کو پاک رکھوایا کہ میرا بندہ پیدل چلتا ہے اس کے پاؤں ملوث نہیں ہونے چاہئیں۔ (تذکرۃ الاولیاء، ص:۱۵۹)

اللہ آپ قدردان ہیں، آپ کتنے مہربان ہیں! وہ وفا جانتے ہیں اور ہم بے قدرے ہیں۔ اس لیے تو اللہ رب العزت کو فرمانا پڑا:

﴿ وَمَا قَدَرُوا اللّٰهَ حَقَّ قَدْرِهٖ ﴾ (الانعام:۹۱)

''انہوں نے اللہ کی قدر نہیں کی جیسی کرنی چاہیے تھی''

مگر اللہ تعالیٰ تو قدردان ہیں، جو محبت کا جذبہ لے کر قدم اٹھاتا ہے اللہ رب العزت اس سے محبت فرماتے ہیں۔ زندگی میں اس کو اس کا اجر آنکھوں سے دکھاتے ہیں۔

عجب چیز ہے لذتِ آشنائی:

یہ محبت کی حلاوت ہی عجیب چیز ہے، یہ نشہ ہی عجیب چیز ہے۔

دو عالم سے کرتی بیگانہ دل کو
عجب چیز ہے لذتِ آشنائی

یہ اللہ رب العزت سے محبت کی آشنائی کی لذت ہی عجیب ہے۔ تو ہم اللہ رب العزت سے محبت کرنے کے لیے یہاں آئے ہیں۔ اب اس کا طریقہ یہ ہے کہ جو چیزیں اللہ کو ناپسند ہیں ان کو گناہ کہتے ہیں۔ ان گناہوں کو کامل چھوڑنے کی نیت ابھی کریں۔ معصیت سے خالی زندگی گزارنے کا ارادہ کریں۔ نیت ہم کریں توفیق اللہ تعالیٰ عطا فرمائیں گے۔

موت کے بعد عشاق کے انداز:

تذکرۃ الاولیاء میں دو تین عجیب واقعات لکھے ہیں، چونکہ عنوان کے مطابق ہیں اس لیے میں آپ کی خدمت میں پیش کر دیتا ہوں۔

⊙......حضرت خواجہ بایزید بسطامی رحمۃ اللہ علیہ اپنی وفات کے بعد کسی کو خواب میں نظر آئے۔ اس نے پوچھا کہ حضرت! آگے کیا بنا؟ تو آپ نے فرمایا کہ میرے پاس منکر نکیر آئے تھے اور مجھے کہنے لگے: او بڑھے! کیا لایا ہے؟ میں نے ان کو یہ جواب دیا کہ جب کوئی بادشاہ کے دربار پر آتا ہے، دروازے پر آتا ہے تو یہ نہیں پوچھتے کہ کیا لایا ہے؟ ہمیشہ یہ پوچھتے ہیں: کیا لینے کے آیا ہے؟ تو میرے جواب سن کر وہ کہنے لگے: اس کا ایمان پکا ہے اور وہ چلے گئے۔

⊙......حضرت جنید بغدادی رحمۃ اللہ علیہ کسی کو خواب میں نظر آئے، پوچھا: حضرت! آگے کیا بنا؟ کہا: بھئی! منکر نکیر آئے تھے، کہنے لگے: مَنْ رَبُّكَ (تیرا رب کون ہے؟) میں نے جواب دیا کہ میرا رب وہی ہے جس نے تمہیں حکم دیا تھا اُسْجُدُوْا لِاٰدَمَ (آدم علیہ السلام کو سجدہ کرو) وہ آپس میں کہنے لگے اس کو سبق بڑا پکا یاد ہے۔ یہ کہہ کر چلے گئے۔

⊙......کسی کو حضرت شیخ عبدالقادر جیلانی رحمۃ اللہ علیہ اپنی وفات کے بعد خواب میں نظر آئے۔ اس نے پوچھا: حضرت! آگے کیا معاملہ ہوا؟ تو فرمایا: منکر نکیر آئے تھے، کہنے لگے: مَنْ رَبُّكَ (تیرا رب کون ہے؟) تو میں نے انہیں کہا کہ دیکھو! تم عرش سے لے کر فرش تک عربوں کھربوں میل نیچے اترے، تم اللہ کو نہیں بھولے، میں زمین سے دو گز نیچے آ کر اپنے رب کو بھول جاؤں گا۔

⊙......اور کسی نے رابعہ بصریہ رحمۃ اللہ علیہا کو خواب میں دیکھا، پوچھا: اماں! آگے کیا بنا؟ کہنے لگیں: منکر نکیر آئے تھے اور مجھ سے پوچھنے لگے: مَنْ رَبُّكَ (تیرا رب کون

ہے؟) پوچھا کہ پھر آپ نے کیا کہا؟ فرمانے لگیں: میں نے انہیں یہ کہا کہ اللہ تعالیٰ سے جا کر کہہ دو کہ اللہ! تیری اربوں کھربوں مخلوق ہے اور اس مخلوق میں سے تو مجھ بڑھیا کو نہیں بھولا۔ میرا تو تیرے سوا کوئی ہے ہی نہیں، کیا میں تمہیں بھول جاؤں گی؟ کیا خوبصورت جواب دیا! اللہ تیری اربوں کھربوں مخلوق ہے اور اس مخلوق میں سے تو مجھ بڑھیا کو نہیں بھولا میرا تو تیرے سوا کوئی ہے ہی نہیں۔

دل میں اللہ کے سوا کچھ نہ ہو:

کاش ہماری بھی زندگی ایسی بن جائے کہ ہمیں اللہ کے سوا کوئی نظر ہی نہ آئے۔ دل کہے کہ

میرا کوئی نہیں اللہ! تیرے سوا

پھر زندگی کا مزا ہے، پھر لطف ہے زندگی کا۔ ہماری امیدوں کی منتہا، آرزوؤں کی منتہا۔ فقط اللہ رب العزت کی ذات ہو جائے۔ اسی کے بارے میں سوچیں، اسی کا ذکر کریں، اسی کا تذکرہ کریں۔ حتیٰ کہ

﴿قُلْ اِنَّ صَلٰوتِیْ وَ نُسُکِیْ وَ مَحْیَایَ وَ مَمَاتِیْ لِلّٰهِ رَبِّ الْعَالَمِیْنَ﴾

(الانعام:۱۶۲)

''میری نماز اور میری عبادت اور میرا جینا اور میرا مرنا سب اللہ ہی کے لیے ہے''

ہمارے بزرگوں نے ایسی پاکیزہ زندگیاں گزاری ہیں۔ ہمیں پچھلے دنوں مخطوطات کی ایک نایاب کتاب ملی، جس میں حضرت خواجہ ابوالحسن خرقانی رحمۃ اللہ علیہ کے ملفوظات تھے۔ کسی اور زبان میں تھی اور جہاں سے ملی وہاں سے لینا بھی بہت مشکل

تھا۔ بہر حال ہمیں مل گئی۔ ہم نے اس کو ترجمہ کروا کر کچھ پڑھنا شروع کیا مگر حضرت کے ایک ملفوظ نے دل کی حالت بدل کر رکھ دی۔ پورا دن روتے گزر گیا۔ سادہ سی بات تھی مگر بات بڑی عجیب تھی۔ حضرت خواجہ ابوالحسن خرقانی رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی ملفوظات میں یہ بات لکھی: اے اللہ! تو جانتا ہے۔ اب غور کرنے کی بات یہ ہے کہ ایسے اللہ والوں کی زبان سے بات کا نکل جانا ہی کافی ہوتا ہے کہ سچے لوگوں سے سچی باتیں نکلتی ہیں۔ لیکن ان کا اللہ کو گواہ بنا کر بات کرنا، بندہ کانپ جاتا ہے یہ الفاظ کہتے ہوئے کہ۔ **علیم بذات الصدور** کو گواہ بنا کر بات کر رہے ہیں۔ انہوں نے یہ بات لکھی: اے اللہ! تو جانتا ہے کہ میں نے زندگی کے (۷۳) تہتر سال اس طرح گزارے کہ میرے دل میں تیرے سوا اور کوئی نہیں تھا۔ اللہ اکبر کبیرا۔ اس فقرے کو پڑھ کر دل کی عجیب حالت ہوئی۔ پورا دن یہی کیفیت رہی۔ ایسے پاکیزہ حضرات تھے، ایسی مقبول ہستیاں تھیں۔ کاش کہ اس مجمعے میں ہم اللہ رب العزت سے یہ نعمت مانگیں کہ اللہ ہمیں بھی یہ نعمت عطا فرما دے۔

عشق کی بازی:

ایک فاسقہ کا شعر ہے جو اس نے دنیا کے محبوبوں کے لیے کہا مگر سمجھنے کی خاطر سنا رہا ہوں کہ اس کو اپنے محبوب کو پانے کی اتنی چاہت تھی کہ اس نے کہا: ؎

اس شرط پہ کھیلوں گی پیا پیار کی میں بازی
جیتوں تو تجھے پاؤں ہاروں گی تو میں تیری

وہ اگر مخلوق کی محبت میں یہ بات کر رہی ہے تو آج ہم بھی اللہ سے ایسا ہی سودا کریں کہ اللہ! ہم بھی اس پیار کی راہ پر قدم اٹھاتے ہیں مگر شرط یہ ہے کہ ہمیں قبول کر

لینا۔ محنت بھی ہو مگر قبولیت نہ ہو تو پھر کیا بنے گا؟ اس لیے اللہ! ہم قدم اٹھا رہے ہیں مگر اس امید کے ساتھ اٹھاتے ہیں کہ ان اٹھتے قدموں کو واپس نہ ہٹنے دیجیے گا۔ ان اٹھے قدموں کو قبول فرما لیجیے گا۔ اور اللہ! قیامت کے دن ہمیں اپنے چاہنے والوں میں شامل کر لیجیے گا۔

روزِ قیامت عشاق کا خصوصی اکرام:

حدیث مبارکہ میں ہے کہ قیامت کے دن ایک آواز دی جائے گی۔ کچھ لوگوں کے اعمال تو انفرادی ہوں گے

﴿جِئْتُمُوْنَا فُرَادٰی كَمَا خَلَقْنٰكُمْ اَوَّلَ مَرَّةٍ﴾ (الانعام:۹۴)

''تم ہمارے پاس اسی طرح تن تنہا آگئے ہو جیسے ہم نے تمہیں پہلی بار پیدا کیا تھا''

وہ فرد فرد آئیں گے اور حساب ہوگا۔ لیکن کچھ لوگ ہوں گے جن کو جماعتی شکل میں لایا جائے گا۔ آواز دی جائے گی۔

اَيْنَ الصَّائِمُوْنَ

''روزہ رکھنے والے کہاں ہیں؟''

جتنے لوگوں کو نفلی روزے رکھنے کی ایک عادت ہوگی، وہ سب اللہ کے سامنے پیش ہوں گے۔

اَيْنَ الزَّاهِدُوْنَ

''زاہدین کہاں ہیں؟''

فلاں کہاں ہیں؟ اور فلاں کہاں ہیں؟

جب آوازیں لگ جائیں گی تو اللہ رب العزت کی طرف سے فرشتہ یہ پیغام

دے گا مجھ سے محبت کرنے والے کہاں ہیں؟ اللہ اکبر کبیرا......اللہ اکبر کبیرا۔ کیا خوش نصیب لوگ ہوں گے! جو اللہ رب العزت کے چاہنے والوں میں شمار کر لیے جائیں گے، عشاق میں شامل کر لیے جائیں گے۔

حضرت مولانا محمد اسلم ملتانی رحمۃ اللہ علیہ جماعت کے بڑے بزرگوں میں سے گزرے ہیں۔ ہمارا زمانۂ طالب علمی تھا تو ایک مرتبہ رائیونڈ کے سالانہ جلسے میں جانے کا موقعہ ملا تو یہ واقعہ وہاں حضرت نے سنایا اور چونکہ عاجز نے براہ راست سنا اس لیے اب اس کو نقل کر رہا ہے۔ بیان کے دوران فرمانے لگے کہ قیامت کے دن کچھ لوگ ہوں گے جو جنت کے دروازے پر اکٹھے ہو جائیں گے اور جنت کے داروغہ رضوان سے کہیں گے، رضوان! دروازہ کھول ہمیں جنت میں جانے دے۔ رضوان حیران ہوگا، اللہ تعالیٰ سے عرض کرے گا: یا اللہ! ابھی تو ان کا میزانِ عدل قائم نہیں ہوا اوروں کا حساب ہو رہا ہے ان کی باری ہی نہیں آئی اور یہ یہاں پہنچ گئے ہیں اور کہتے ہیں کہ دروازہ کھول ہمیں جانے دے۔ تو جب رضوان اللہ سے یہ کہے گا تو رب کریم اس وقت فرمائیں گے: رضوان! یہ میرے چاہنے والے میرے عشاق کی جماعت ہے۔

...... یہ دنیا میں میری محبت میں راتوں کو جاگا کرتے تھے۔

...... یہ لمبے سجدے کیا کرتے تھے۔

...... یہ بھوک پیاس برداشت کیا کرتے تھے۔

رضوان انہوں نے دنیا کی سب نعمتوں کو اس امید پر لات ماردی تھی کہ ان کو جنت میں میرا دیدار نصیب ہوگا۔ اگر یہ ملاقات گاہ کے دروازے پر پہنچ گئے ہیں اور ملاقات گاہ میں آنا چاہتے ہیں تو اے رضوان! دروازہ کھول دے، بغیر حساب ان کو جنت میں داخل ہونے دے کیونکہ ان کا حساب لیتے ہوئے مجھے حیا آتی ہے۔

اللہ! عشق کا ساغر پلا دیجیے!

اے اللہ! آپ ہمیں بھی ان خوش نصیبوں میں شامل فرما لیجئے! ہمیں بھی اپنی محبت والی نعمت عطا فرما دیجیے۔ اللہ! ہماری محنتیں اس قابل نہیں ہیں، ہماری اندر صلاحیتیں نہیں ہیں، میرے مولا کوئی استعداد نہیں ہے۔ ہاں بس تیرے کرم پر نظر رکھ کر آئے ہیں اور تیرے محبوب بندے کی اس جگہ پر حاضر ہوئے ہیں۔ اللہ یہاں پہلے بھی ساغر پلائے جاتے تھے۔ اللہ آپ تو وہی ہیں اور ساغر بھی وہی محبت کے چاہتے ہیں۔ اللہ! آج اس مجمعے کو یہ ساغر پلا دیجیے۔

میرے مولا! اس مجمعے میں کتنے نوجوان ہیں، رات کو توبہ کرتے ہیں صبح توڑ بیٹھتے ہیں، صبح توبہ کرتے ہیں رات توڑ بیٹھتے ہیں۔ اللہ یوسف علیہ السلام کے لیے تو ایک زلیخا تھی ان کے پیچھے تو درجنوں زلیخائیں ہوتی ہیں۔ میرے مولا! یہ اس گرد سے نکل کر تیری تلاش میں یہاں آئے ہیں، مولا! اگر آپ نے خالی لٹا دیا، یہ جوانیاں ضائع ہو جائیں گی۔ نفس و شیطان بہکا دیں گے۔ اے کریم! ہمارے پاس خالی دامنی کے سوا کچھ بھی نہیں، بس دامن پھیلا دیئے ہیں، تیری رحمت پر نظر جما دی ہے، اللہ! کرم کی نظر فرما دیجیے کہ تیری اک نگاہ کی بات ہے میری زندگی کا سوال ہے۔ اللہ ہم نے یہ سنا ہے جو دنیا میں آپ سے محبت کرے گا آپ کی رحمت سے یہ بعید ہے کہ آپ قیامت کے دن اپنے دشمنوں کی قطار میں اسے کھڑا فرما دیں۔ لہٰذا اللہ! اپنی رحمت کر دیجیے اور ہمیں اپنی محبت کی نعمت یہاں عطا فرما دیجیے، دلوں کو محبت سے بھر دیجیے۔

﴿وَاٰخِرُ دَعْوٰنَا اَنِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ﴾

﴿وَاذْكُرِ اسْمَ رَبِّكَ وَتَبَتَّلْ اِلَيْهِ تَبْتِيلًا﴾

(المزمل:۸)

ذکر کی محنت ضروری ہے

بیان: محبوب العلما والصلحا، زبدۃ السالکین، سراج العارفین

حضرت مولانا پیر ذوالفقار احمد نقشبندی مجددی دامت برکاتہم

تاریخ: 28 دسمبر 2011ء بروز بدھ ،۳ صفر ۱۴۳۳ھ

موقع: علما طلبا سے خطاب

مقام: معہد الفقیر الاسلامی جھنگ

اقتباس

آپ ذرا غور کریں! ہم جتنے یہاں بیٹھے ہیں۔ چاہے مفتی ہیں، چاہے حدیث پڑھاتے ہیں، چاہے خلیفہ صاحب ہیں، چاہے پیر صاحب ہیں۔ ہم ذرا دل میں یہ غور کریں کہ کیا واقعی ہمیں معبودوں کی نفی کامل حاصل ہے؟ یا ہم کسی نہ کسی کی پرستش میں پھنسے ہوئے ہیں۔ تو دل جواب دے گا کہ ہم سے تو آنکھ قابو ہی نہیں ہوتی۔ تو اللہ کی بجائے نفس کی پوجا زیادہ کی۔ جھوٹ بولا تو نفس کی چاہت پوری کی، خدا کے بجائے۔ اسی طرح اور خلافِ شرع کاموں میں بھی...... اس کا مطلب ہے کہ ابھی جان نہیں چھوٹی ہماری۔ تو یہ جان کب چھوٹے گی؟ اس کے لیے محنت کرنی پڑے گی۔ محنت کریں گے تو یہ من ایسا صاف ہو جائے گا کہ اس کے بعد انسان ہر کام اللہ کی رضا کے لیے کرے گا۔

(حضرت مولانا پیر ذوالفقار احمد نقشبندی مجددی مدظلہ)

ذکر کی محنت ضروری ہے

اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ وَكَفٰى وَسَلَامٌ عَلٰى عِبَادِهِ الَّذِيْنَ اصْطَفٰى اَمَّا بَعْدُ:
فَاَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطٰنِ الرَّجِيْمِ o بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ o
﴿وَاذْكُرِ اسْمَ رَبِّكَ وَتَبَتَّلْ اِلَيْهِ تَبْتِيْلًا﴾ (المزمل:۸)
وَقَالَ اللّٰهُ تَعَالٰى فِيْ مَقَامٍ آخَر
﴿قَدْ اَفْلَحَ مَنْ تَزَكّٰى وَ ذَكَرَ اسْمَ رَبِّهٖ فَصَلّٰى o﴾
سُبْحَانَ رَبِّكَ رَبِّ الْعِزَّةِ عَمَّا يَصِفُوْنَ o وَسَلَامٌ عَلَى الْمُرْسَلِيْنَ o
وَالْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ o
اَللّٰهُمَّ صَلِّ عَلٰى سَيِّدِنَا مُحَمَّدٍ وَّعَلٰى اٰلِ سَيِّدِنَا مُحَمَّدٍ وَّبَارِكْ وَسَلِّمْ

لڑکپن کا ایک مشاہدہ:

لڑکپن کی بات ہے کہ ہماری گلی میں سے ایک آدمی گزرتا تھا، آواز لگاتا تھا: ''برتن قلعی کرالو''۔ میری عمر اس وقت تھی کوئی تین چار سال۔ جس وقت بھی اس کی آواز لگتی تھی تو میں بھاگا ہوا اپنی امی کے پاس جاتا تھا اور انہیں کہتا تھا کہ امی! قلعی کرانے کے لیے برتن دے دو، وہ میری چاہت کو دیکھتے ہوئے نہیں بھی کروانے ہوتے تھے تو بھی برتن دے دیتی تھیں۔ آج کل تو پلاسٹک کے برتن عام ہیں، اس زمانے میں پیتل کے بنے ہوئے برتن ہوتے تھے۔ جب وہ میلے ہوجاتے تھے تو ان پر قلعی کروالیتے تھے، جس سے وہ چمک جاتے تھے۔ تو ایک دو تین، جو بھی برتن ہوتے تھے میں اس کے پاس لے کر جاتا تھا کہ یہ قلعی کرنے ہیں۔ وہ اپنا سارا سامان سائیکل

سے اتارتا، ایک انگیٹھی ہوتی تھی، اس میں کوئلے ڈال کر اسے گرم کرتا، پھر اس میں ہوا دینے کے لیے ایک سسٹم بنایا ہوا تھا جس سے آگ تیز ہو جاتی تھی۔ جب وہ کام کرتا تھا تو میں ساتھ بیٹھتا تھا اور دیکھتا تھا کہ یہ کرتا کیا ہے؟ کام وہ سمپل سا تھا جو اس چھوٹی عمر میں بھی میں سمجھتا تھا کہ یہ کیا کر رہا ہے؟

پہلے برتن کو آگ پر خوب اچھی طرح گرم کرتا۔ جتنی دیر وہ اسے گرم کرنے میں لگاتا تھا، مجھے انتظار میں بیٹھنا پڑتا تھا کیونکہ میں اس سے اگلا منظر دیکھنے کا شوقین زیادہ تھا۔ اگلا منظر یہ تھا کہ وہ جب گرم ہو جاتا تو ایک نوشادر قسم کی چیز کا پاؤڈر اس سارے برتن کو لگاتا تھا۔ مجھے سمجھ نہیں آتی تھی کہ اس نے پاؤڈر ٹائپ کوئی چیز لگائی ہے اور دھواں سا اٹھا ہے اور ہوا تو کچھ بھی نہیں۔ پھر وہ کاٹن لے کر سارے برتن پر خوب اچھی طرح پھیرتا اور پھر گرم کرتا۔ پھر جب خوب اچھی طرح گرم ہو جاتی تو وہ قلعی نکالتا تھا، اس قلعی سے دو تین نشان لگاتا تھا۔ پھر کپاس لے کر جو اسے یوں پھیرتا تھا تو پورے برتن پر قلعی چڑھ جاتی تھی۔ اتنا چمکتا تھا برتن کہ حیران ہوتے تھے کہ یہ وہی برتن تھا جو دیکھنے میں میلا نظر آتا تھا، اب تو یہ چاندی کی طرح چمک گیا ہے۔ تو یہ برتن قلعی کرانا یہ اس زمانے میں ہمارے لیے انٹرسٹ (دلچسپی) کی چیز ہوتی تھی۔

ایک دفعہ میں نے اس سے پوچھ لیا: بھئی! یہ جو قلعی ہے یہ آپ شروع سے ہی کیوں نہیں لگا دیتے؟ یہ پہلے اتنا لمبا سلسلہ کیوں کرنا پڑتا ہے؟ تو اس نے مجھے سمجھایا کہ بچہ تم چھوٹے ہو، نہیں سمجھ سکتے۔ دراصل برتن کے اوپر چکنائی، میل اور پتہ نہیں کیا کیا چیزیں اس کے اوپر لگی ہوتی ہیں؟ تو میل جمی ہونے کی وجہ سے، روغن لگے ہونے کی وجہ سے قلعی نہیں چڑھتی۔ لہٰذا پہلے گرم کرتے ہیں اور نوشادر سے اس کی ساری میل ختم کرتے ہیں، جب میل ختم ہو جاتی ہے، صاف شفاف ہو جاتا ہے تو اب اس کے

اوپر تھوڑی سی بھی قلعی لگا دیتے ہیں تو وہ پورے برتن پر چڑھ جاتی ہے۔ یہ تو بچپن کی بات ہے جو کئی مرتبہ اب بھی یاد آتی ہے۔

انسان کی اصلاح کی ترتیب:

مشائخ نے بھی انسان کی اصلاح کی ترتیب اسی طرح بنائی ہے کہ انسان پہلے دل کو گناہوں سے صاف کرے، گناہوں کے داغ دھوئے، میل کچیل کو دھوئے۔ جب یہ گناہوں کے میل کچیل کو دھولے گا تو اللہ کی رحمت کی نظر پڑے گی اور دل منور ہو جائے گا۔ اب میل کچیل کو دھونا یہ ہمارا فریضہ ہے۔

دل کو صاف رکھنا کس کی ذمہ داری ہے؟

ہمارا دل تو اللہ کا گھر ہے، اسے صاف رکھنے کی تو بہت زیادہ ضرورت ہے۔ یہاں ایک طالب علم کے ذہن میں سوال پیدا ہوتا ہے کہ جس کا گھر ہوتا ہے وہ تو خود اپنے گھر کی صفائی کا انتظام کرتا ہے۔ اسی طرح یہ دل اللہ کا گھر ہے تو اس کی صفائی بھی اللہ کی طرف سے ہونی چاہیے؟ جواب یہ ہے کہ دستور ہے کہ کرایہ دار نے اگر کرایہ پر گھر لیا ہوا ہے تو اس کی صفائی مالک نہیں کرواتا بلکہ کرایہ دار خود صفائی کرواتا ہے۔ وہ پابند ہوتا ہے گھر کو صاف رکھنے کا۔ اور اگر گھر کو صاف نہ رکھے تو مالک نکال دیتا ہے کہ تو اس قابل نہیں ہے کہ یہاں رہے، تو نے تو میرا گھر گندا کر دیا۔ اسی طرح ہمارا حال بھی وہی ہے کہ ہم اس دنیا میں کرایہ دار کی حیثیت سے رہتے ہیں، تو اللہ تعالیٰ نے ہمارے ذمے لگا دیا کہ تم میرا گھر صاف رکھو! اب اگر ہم میلے دل کو اللہ کے سامنے پیش کریں گے تو اللہ رب العزت تو ناراض ہوں گے۔ وہ کہیں گے کہ اپنے گھر میں تو تم روزانہ صفائی کرواتے تھے اور بہت چمکا کر رکھتے تھے اور میرے گھر کا تم نے خیال

ہی نہیں رکھا۔ بات تو ٹھیک ہے، آپ مسجد کو نہیں دیکھتے؟ کیا کبھی ہم نے مسجد کے اندر پاخانہ یا اور کوئی نجاست برداشت کی ہے؟ یہ چیز ہم کبھی برداشت ہی نہیں کر سکتے کہ مسجد ہو اور اس میں نجاست ہو۔ اسی طرح دل اللہ کا گھر ہے اور اس میں ہم گناہوں کی نجاست پھیلاتے رہتے ہیں اور اس کی ہمیں پرواہی نہیں ہوتی کہ ہم کیوں اللہ کے گھر کو گندا کر رہے ہیں۔ اس لیے تو اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

''نہ میں زمینوں میں سماتا ہوں، نہ آسمانوں میں سماتا ہوں، میں مومن بندے کے دل میں سماجاتا ہوں''

تو یہ قلب جو اللہ کا گھر ہے، اسے بہت صاف رکھنا چاہیے۔

وساوس کو کنٹرول کرنے کی ضرورت:

اللہ کی شان کہ اسی قلب کے اندر وسوسے ہوتے ہیں۔ جتنے نفسانی شیطانی وسوسے ہوتے ہیں، یہ کہاں پر ہوتے ہیں؟ یہ قلب میں ہوتے ہیں۔ اب ان وسوسوں کو ہمیں کنٹرول کرنے کی ضرورت ہے۔

قرآن کا آخری پیغام:

دنیا کا دستور ہے کہ جب کوئی کتاب لکھتے ہیں تو اس کے آخر پر وہ بات لکھتے ہیں جو پوری کتاب کا لب لباب اور نچوڑ ہوتی ہے۔ تقریر کرتے ہیں تو تقریر کے آخر پر وہ بات کرتے ہیں جو پوری تقریر کا خلاصہ ہوتی ہے۔ اللہ رب العزت نے بھی جو اپنی کتاب بھیجی تو اس کتاب کے آخر پر وہ چیز رکھی جو پوری کتاب کا خلاصہ ہے۔ آخری سورت میں کیا ہے؟

﴿قُلْ أَعُوذُ بِرَبِّ النَّاسِ o مَلِكِ النَّاسِ o اِلٰهِ النَّاسِ o مِنْ شَرِّ

الْوَسْوَاسِ الْخَنَّاسِo﴾ (الناس:۱۔۴)

تو آخر پر ''خَنَّاسْ'' کے وساوس سے پناہ مانگتا ہے۔اس سے معلوم ہوا کہ خناس کے وساوس سے پناہ مانگنا یہ لب لباب ہے پورے قرآن کا، کہ دل سے یہ شیطان کے وسوسے ختم ہو جائیں اور دل منور ہو جائے۔

وساوس سے پناہ، زندگی کے تین حصوں میں:

اور اس سورت میں بار بار اَلنَّاسِ کا لفظ استعمال کیا۔حالانکہ کوئی ضمیر استعمال کر لیتے تو بھی کلام تو ہو سکتا تھا۔لیکن ضمیر کو استعمال نہیں کیا ناس کا لفظ استعمال کیا۔

اور اس میں مزے کی چیز دیکھیں کہ ﴿قُلْ أَعُوذُ بِرَبِّ النَّاسِ﴾ ایک دفعہ ''النَّاس'' کا لفظ استعمال ہوا ﴿مَلِكِ النَّاسِ﴾ دوسری دفعہ استعمال ہوا ﴿اِلٰهِ النَّاسِ﴾ تیسری دفعہ ''النَّاس'' استعمال ہوا۔آگے ﴿مِن شَرِّ الْوَسْوَاسِ الْخَنَّاسِ﴾ تو تین دفعہ النَّاس کا لفظ آیا۔تین مرتبہ لفظ آیا اور پھر شیطان سے پناہ مانگی۔وجہ کیا تھی؟ وجہ یہ تھی کہ انسان کی زندگی کے تین حصے ہوتے ہیں۔

ایک حصہ ہوتا ہے بچپن کا۔بچپن میں بچے کی تربیت ہو رہی ہوتی ہے، پرورش پا رہا ہوتا ہے تو اس کے ماں باپ بھی اس کے لیے تربیت کا کام کرتے ہیں۔تربیت کے موقع پر اللہ تعالیٰ نے رب کا لفظ استعمال کیا ﴿قُلْ أَعُوذُ بِرَبِّ النَّاسِ﴾۔

پھر بچہ جوان ہو گیا۔تو جوانی میں یہ ملکی کاموں میں حصہ لیتا ہے، سیاست میں حصہ لیتا ہے، اب اس کے لیے (مَلِك) کا لفظ زیادہ موزوں ہے، کیونکہ ملکی انتظامات سنبھالنے ہیں۔یا فیکٹری سنبھال لی، دکان سنبھال لی، بھرپور جوانی ہے، گھر کا کام سنبھال لیا، برادری کا کام سنبھال لیا۔تو چونکہ اب یہ منیجمنٹ کے معاملے میں آ گیا تو اب اس کے لیے اللہ تعالیٰ کی عظمت (مَلِك) کے لفظ سے بیان کی گئی۔

اور زندگی کا تیسرا حصہ بڑھاپے کا ہوتا ہے۔ اور بڑھاپے میں عام طور پر دیکھا ہے کہ ''نوسو چوہے کھا کر بلی حج کو چلی''۔ بڑھاپے میں اور تو کچھ ہوتا نہیں تو چلو حج ہی کر آئیں تو نیک بھی بن جاتے ہیں۔ شرابی نیک بن گیا، زانی نیک بن گیا، ڈاکو نیک بن گیا، جوانی میں ہر قسم کا الٹا سیدھا کام کرنے والا بڑھاپے میں آ کر نمازی بن جاتا ہے۔ مسجد میں آنے لگ جاتا ہے تو بڑھاپے کے لیے ''عبادت'' کا لفظ استعمال ہوا ﴿اِلٰهِ النَّاسِ﴾

انسان کی زندگی کے تینوں مراحل سٹیجوں کی بات کی۔ پھر آگے فرمایا:

﴿مِنْ شَرِّ الْوَسْوَاسِ الْخَنَّاسِ﴾ (الناس:۴)

خناس کے شر سے اللہ کی پناہ مانگی۔

وساوس دل میں آتے ہیں:

کون سے خناس سے پناہ مانگی؟

﴿اَلَّذِیْ یُوَسْوِسُ فِیْ صُدُوْرِ النَّاسِ﴾ (الناس:۵)

''جو انسانوں کے سینے میں وسوسے ڈالتا ہے''

سینے میں تو انسان کا دل ہے تو یہ وسوسے دل میں آتے ہیں۔

وساوس ختم کرنے کے لیے محنت کی ضرورت ہے:

اس لیے ہمیں اس دل سے اپنے وساوس کو ختم کرنے کے لیے محنت کرنے کی ضرورت ہے۔ یہ وسوسے اس وقت تک ختم نہیں ہوں گے جب تک محنت نہیں کریں گے۔ جو کہا گیا:

''چهل سال عمرِ عزیز ست گزشت''

کہ عمرِ عزیز کے چالیس سال گزر گئے اور میرا حساب بچوں کی طرح ہی رہا۔
وجہ کیا ہوتی ہے؟ محنت نہیں کی ہوتی۔

پیرانہ سالی میں وساوس کی پریشانی:

ایک علاقے کے حاجی صاحب تھے۔ وہ اپنے علاقے کے نمبر دار تھے اور علاقے میں ان کی بہت شہرت تھی۔ وہ بہت دین کا فکر رکھنے والے تھے۔ اپنے علاقے سے جماعتوں کو نکالتے، نیکی کی دعوت دیتے، کسی کو اس علاقے میں خلافِ شریعت کام نہ کرنے دیتے، غریبوں پر خرچ بھی کرتے تھے، علاقے میں ہر ضرورت مند کی ضرورت بھی پوری کرتے تھے، مسجد کا خیال رکھتے تھے، اللہ کے راستے میں خرچ کرتے، کیونکہ ذی حیثیت بھی تھے۔ تو لوگ ان کے اخلاق سے بہت متاثر تھے۔ جہاں جھگڑا ہوتا وہ ثالث بن کر جاتے، جہاں کہیں دو فریقین کا مسئلہ ہوتا تو وہی جج بنتے تھے۔ اتنے ہر دلعزیز تھے کہ لوگ ان کو امیر المؤمنین کہتے تھے۔ اور ان کی عمر کوئی اسی سال سے اوپر ہو گئی تھی۔ ان کے داڑھی کے بال بھی سفید تھے اور بھنوؤں کے بال بھی سفید۔

ایک دن اس عاجز کو ملنے کے لیے آئے۔ چونکہ مجھے ان کا تعارف پہلے سے تھا اس لیے میں نے ان کو بٹھایا اور چائے وغیرہ پلائی۔ میں نے پوچھا: جی! آپ کیسے تشریف لائے؟ بس میرا پوچھنا تھا کہ ان کی آنکھوں سے ٹپ ٹپ آنسو بہنے لگے، زار و قطار رونے لگ گئے۔ میں نے ان کو تسلی دی، پوچھا کہ مسئلہ کیا ہے؟ کہنے لگے: مسئلہ یہ ہے کہ میں باقاعدگی سے باجماعت نماز پڑھتا ہوں۔ تہجد، اشراق، اوابین بھی پڑھتا ہوں۔ سنتوں کا پابند ہوں، علاقے میں کوئی غیر شرعی کام ہو تو میں مخالفت بھی

کرتا ہوں۔ میری وجہ سے ہزاروں بندے اللہ کے دین پر آئے ہیں، اور میں سارا کچھ اللہ کے لیے کرتا ہوں۔ لیکن میری حالت یہ ہے کہ عمر اسی سال سے زیادہ ہوگئی، میری نگاہ اب بھی پاک نہیں ہے، یہ کہہ کر پھر رونا شروع کر دیا۔ کہنے لگے: اس وقت میرے اندر عورت کے ساتھ تعلق قائم کرنے کی طاقت ہی نہیں رہی۔ مرد والی قوت میرے اندر ہے ہی نہیں، بیوی میری گھر میں ہے لیکن میری جو حسرت اور خواہش ہے وہ ایسے ہے جیسے کوئی سولہ سال کا لڑکا ہو۔ ہر لڑکی پر نظر پڑتی ہے، ہر اجنبی عورت پر نظر پڑتی ہے۔ لوگ مجھے پتہ نہیں کیا فرشتہ سمجھ رہے ہوتے ہیں اور میری نظر میں پاکیزگی نہیں ہوتی۔ مجھے بتائیں میں کیا کروں؟ مجھے جہنم کی آگ سامنے نظر آرہی ہے۔ جب انہوں نے یہ بات کی تب مجھے واقعی یہ بات سمجھ آئی کہ ہمارے بزرگوں نے کہا:

چہل سال عمرِ عزیزست گزشت

کہ اگر چالیس سال بھی عمر عزیز کے گزر جائیں اور محنت نہ کی ہو تو حال اندر کا بچے ہی کی طرح رہتا ہے۔ جب تک آپ محنت نہیں کریں گے، وساوس سے جان چھڑانے کے لیے، نوے سال کی عمر کے بھی ہو گئے تو وساوس سے جان نہیں چھوٹے گی۔

☆...... دیہات سے ایک بڑے میاں میرے پاس آئے۔ آنکھیں صحیح طرح سے دیکھتی نہیں تھیں، نظر پر موتیا بند آ گیا تھا، لاٹھی پر چلتے ہوئے دوسرے کا ہاتھ پکڑے ہوئے آئے۔ میں نے ان سے پوچھا: باباجی! کیسے آئے؟ کہنے لگے کہ دعا کرو میرے دماغ سے شیطانی وسوسے ختم ہو جائیں۔

تو زندگی گزار بیٹھتے ہیں، جو مقصدِ زندگی ہے شیطانی وساوس سے نجات پانا وہ نصیب نہیں ہوتا۔

محنت سے وساوس کا خاتمہ:

اور اگر انسان محنت کرے تو جوانی میں بھی وسوسے ختم ہو جاتے ہیں۔مثال سنیں۔

ہمارے ایک قریبی تعلق والے ہیں۔ ماشاءاللہ وہ کاروبار کرتے ہیں۔ کہنے لگے کہ میں چائنا گیا۔ کچھ چیزیں خریدنی تھیں، کنٹینرز خریدنا تھا۔وہاں جب میں ایئر پورٹ پر اترا تو تب مجھے پتہ چلا کہ جس نے لینے کے لیے آنا تھا، جو مالک تھا فیکٹری کا، وہ مرد نہیں وہ عورت تھی۔ اور میں خط و کتابت میں ان کو مسٹر مسٹر لکھتا رہا تھا۔ میں باہر نکلا تو میں نے دیکھا کہ دو جوان جوان لڑکیاں کھڑی ہیں۔ میرے پاس آئیں، انہوں نے مجھے کارڈ دکھایا جس پر میرا نام لکھا ہوا تھا کہ آپ یہی ہیں؟ میں نے کہا: جی ہاں! مجھ سے کہنے لگی کہ میں فیکٹری کی مالک ہوں اور یہ میری سیکرٹری ہے اور ہم آپ کو لینے کے لیے آئے ہیں۔اب میں پریشان کہ یا اللہ! اب میں ان کو اگر ناں کر دوں تو جب پیچھے جاؤں گا تو جو بھائی لوگ کاروبار میں شریک ہیں، وہ کہیں گے: تو نے اتنا کرایہ خرچ کیا، ویزہ لیا، اور ایسے ہی واپس آ گیا۔ کام بھی کوئی نہ ہوا اور جو پیسہ لگا یا وہ بھی برباد ہوا۔اب ان کے ساتھ میٹنگ تو کرنی ضروری تھی۔ کہنے لگے: میں ان کے ساتھ چلا گیا۔ وہ مجھے آفس میں لے گئیں اور ٹیبل پر بیٹھ گئیں، میں ادھر دوسری طرف بیٹھ گیا۔اب انہوں نے سامان نکالا، لسٹیں نکالیں جو پہلے سے ہماری ڈاک چل رہی تھی۔ کہنے لگے: چار گھنٹے لگے، انہوں نے ایک ایک آئٹم پڑھی، اس کی تفصیلات کو طے کیا۔ کہنے لگے: حضرت! اللہ کو حاضر ناظر جان کر کہتا ہوں، چار گھنٹے دونوں کے ساتھ میری میٹنگ ہوئی، ان میں سے کسی کے چہرے پر میری نظر نہیں پڑی۔

اندازہ کریں کہ جس بندے کی عمر تیس پینتیس سال ہے، وہ چار گھنٹے دو بے پردہ

قسم کی لڑکیوں سے بیٹھ کر بات کرتا ہے اور اس کی نظر نہیں اٹھتی۔اور یہاں اسی سال عمر گزر گئی، اندر قوت بھی نہیں رہی اور سوچ پھر بھی ناپاک ہے۔کہتے ہیں اِدھر اُدھر سے جو کوئی گزر رہی ہوتی ہے ہر ایک پر میری نظر پڑتی ہے۔تو اس لیے اس نظر کی حفاظت بہت ضروری ہے۔

شیطان کے عجیب دھوکے:

شیطان عجیب وغریب دھوکے دیتا ہے۔کہتے ہیں جی دیکھنے سے کیا ہوتا ہے؟ سوچنے کی بات ہے یہ جو قرآن مجید میں فرمایا: ﴿فَسْئَلُوْهُنَّ مِنْ وَّرَآءِ حِجَابٍ﴾ (الاحزاب:۵۳) (حجاب کے پیچھے سے مانگو) اس کی کیا ضرورت تھی؟ اور حجاب بتا رہا ہے کہ چہرے کا پردہ ہوتا ہے۔

ایک صاحب مجھے کہنے لگے جی! چہرے کا پردہ تو نہیں ہے۔میں نے کہا: تم بتاؤ کہ حجاب کی آیتیں نازل ہوئی تھیں یا نہیں؟ کہنے لگا: نازل تو ہوئی تھیں۔میں نے کہا: یہ بتاؤ کہ کیا حجاب سے پہلے نبی علیہ الصلوٰۃ والسلام کی بیویاں ننگے سر پھرتی تھیں کہ اس کے بعد سر کو ڈھانپنے کا حکم ہوا۔آخر حجاب کا مطلب کیا تھا؟ حجاب کا مطلب تو یہی ہے کہ چہرے پہلے کھلے ہوتے تھے اب حکم ہوا تو ڈھانپنے لگ گئے۔اسے حجاب کہتے ہیں۔

کبھی شیطان کوئی اور دھوکا دے دیتا ہے۔ایک صاحب مجھے ملے جو جامعہ اشرفیہ سے فارغ التحصیل تھے۔انہوں نے کیا تحقیق کی بات فرمائی؟ کہنے لگے: حضرت! وہ حکم ہے نا کہ رشتہ ڈھونڈنا ہو تو پہلی نظر دیکھی جا سکتی ہے، میں جس کو بھی دیکھتا ہوں اسی نظر سے دیکھتا ہوں۔میں نے کہا: آپ تو دیکھتے ہیں اس نظر سے کہ میں رشتہ اس کے ساتھ کروں یا نہ کروں اور اگر وہ پہلے ہی کسی کی بیوی ہو تو؟ پھر چپ ہو گئے۔شیطان نے کیسے کیسے دھوکے دیے ہوئے ہیں؟ اور بے محابہ دیکھ رہے ہوتے

ہیں۔

نظر کی حفاظت سے ایمان کی حلاوت:

چونکہ نظر کی پاکیزگی حاصل نہیں ہوتی اس لیے نتیجے میں ایمان کی حلاوت نصیب نہیں ہوتی۔ اب سوچیں کہ وضع قطع بھی دین داروں والی، چوبیس گھنٹے نام بھی دین کا لگا ہوا ہے کہ طالب علم ہیں، پڑھتے ہیں، گھر والوں نے بھی دین کے لیے فارغ کیا ہوا ہے، استاد بھی دین پڑھاتے ہیں، اب ہم اتنا کر کرا کے بھی صرف نظر کی حفاظت کی وجہ سے اس حلاوت سے محروم رہیں تو ہم نے کیا کمایا؟ یہ تو پھر ہم نے نقصان کا سودا کیا۔ تو سچی بات یہ ہے کہ جب اتنی قربانیاں دے چکے تو ایک قدم اور بھی اٹھالیں، نظر کی بھی حفاظت کرلیں، پھر دیکھیں کہ اللہ تعالیٰ کیا حلاوت عطا فرماتے ہیں۔

حدیث پاک میں ہے: ''جو بندہ غیر محرم سے اپنی نظر کو بچاتا ہے، اللہ تعالیٰ اسے عبادت کی لذت عطا فرماتے ہیں'' (المعجم الکبیر ص :۹،۷۶، رقم ۱۰۳۶۲)۔ یہ عبادت کی لذت تب ملتی ہے جب کوئی بندہ اللہ کے لیے کوئی چیز چھوڑتا ہے۔ اللہ تعالیٰ ہمیشہ اس سے بہتر اس کا بدل دیتے ہیں۔ یہ مخلوق تو بدل بھی نہیں دیتی۔ اللہ تعالیٰ بدل ہی نہیں، اس بندے کو نعم البدل بھی عطا فرماتے ہیں۔ اس سے بہتر عطا فرماتے ہیں۔ تو غیر محرم کو دیکھنے کی لذت چھوڑی، اس کے بدلے اللہ تعالیٰ عبادت کی لذت عطا فرماتے ہیں۔ وہ عارضی چیز تھی یہ دائمی چیز ہے، وہ آنکھ کی لذت تھی یہ دل کی لذت ہے۔

بدنگاہی کا روڈ بلاک:

آج کل اکثر لوگوں کا جو مسئلہ ہے، وہ نظر کا ہے۔ جس نے نظر کی حفاظت کی وہ پھر سلوک میں یوں بھاگتا ہے جیسے موٹر وے ہو۔ یہ نظر کی حفاظت نہ کرنا، یہ انسان کے

لیے روڈ بلاک بنا ہوا ہے۔ نظر کی حفاظت کرنا شروع کریں تو انسان کو ایسی حلاوت ملتی ہے پھر انسان کو باقی کام کرنے بھی آسان ہو جاتے ہیں۔

اٹھارہ سالہ نوجوان کا نگاہ پر کنٹرول:

ہمارے ایک قریبی ساتھی تھے۔ وہ حافظِ قرآن تھے، ۱۸ سال ان کی عمر تھی اور ان کے والد صاحب تبلیغی جماعت میں بہت وقت لگاتے تھے۔ ان کا کپڑے کا کام تھا۔ انہوں نے میٹرک کے امتحان کے بعد اپنے بیٹے سے کہا کہ اب تو نے میرے ساتھ دکان پر ڈیوٹی دینی ہے۔ ایک دن روتے ہوئے آئے کہ ابو کی کپڑے کی دکان ہے اور اس میں عورتوں کے بھی کپڑے ہوتے ہیں اور مردوں کے بھی ہوتے ہیں۔ مجھے کام کرنے کا حکم ہوا ہے۔ میں اس دکان پر کیسے جاؤں؟ میں نے کہا کہ آپ کے والد صاحب کے کپڑے کی دکان ہے، تم ان کی بات مان لو! اللہ خیر فرمائے گا۔

اللہ کی شان دیکھیں کہ جب تجارت شروع کی تو ایک مہینے کے بعد ابو نے کہا کہ میں تو صرف مردوں کو ڈیل کروں گا اور عورتوں کو کپڑے دکھانا اب تمہارے ذمے ہے۔ اس زمانے میں شٹل کاک برقعے زیادہ ہوتے تھے۔ اس برقعے میں یہ ہوتا تھا کہ پردے میں ہیں تو پردے میں ہیں اور جب چہرہ کھلتا تھا تو پھر نیچے سے سارا ہی کھلتا تھا۔ سب کچھ سامنے آجاتا۔ اب وہ پریشان کہ میں کیا کروں؟ میں نے کہا: بھئی! دیکھیں اب آپ کام کر رہے ہیں تو نگاہ کی حفاظت کریں۔ انہیں جب میں نے بات سمجھائی کہ اللہ کی طرف سے اجر ملے گا تو بات ان کی سمجھ میں آ گئی۔ پانچ سال اس بچے نے اپنے والد کے ساتھ کام کیا، محلے کی عورتیں ہمارے گھر میں آکر بتاتی تھیں کہ ہم قسم کھا کر کہہ سکتی ہیں کہ اس نے آج تک ہماری طرف نظر اٹھا کر نہیں دیکھا۔ یعنی وہ خود نہیں، عورتیں اس چیز کی قسم کھاتی تھیں۔

محنت تو کرنی پڑتی ہے:

اگر محنت کی ہو تو اٹھارہ سال میں بھی ایسی نظر کی حفاظت، اور پینتیس سال کا بھرپور جوان بھی ایسی نظر کی حفاظت کرتا ہے، اور اگر محنت نہ کی ہو تو اسی سال کے بوڑھے کی نگاہ بھی قابو میں نہیں۔ محنت تو کرنی ہی پڑے گی۔ یہ چیز خود بخود نہیں ملے گی۔ یہ ذہن سے ہی نکال دیں کہ ایک وقت آئے گا کہ سوچ خود بخود پاک ہو جائے گی، نہیں یہ وقت کے ساتھ ساتھ اور میلی ہوتی جائے گی۔ ابھی تو نوجوانوں نے دیکھا کچھ نہیں اور جب وقت کے ساتھ پتہ چلے گا کہ شادی وغیرہ کا کیا معاملہ ہوتا ہے تو پھر وقت کے ساتھ اور سوچیں آئیں گی۔ اس لیے اس کا حل یہی ہے کہ محنت کی جائے، مجاہدہ کیا جائے اور اس گند کو دھویا جائے، صاف کر دیا جائے۔

دل کی صفائی اللہ کے نام کے ساتھ ہوتی ہے:

اور یہ گند دھویا جاتا ہے اللہ کے ذکر کے ساتھ۔ اللہ کا جو لفظ ہے، یہ انسان کو مخلوق سے کاٹتا ہے اور اللہ سے جوڑتا ہے، اس کے اندر یہ خوبی ہے۔ لوگ کہتے ہیں نا کہ مختلف اذکار میں مختلف تاثیر ہوتی ہے۔ تو یہ جو اللہ کا نام ہے، اسم جلالہ ''اللہ'' اس میں یہ خوبی ہے کہ جو بندہ اللہ اللہ کا ذکر اور مراقبہ کرتا ہے تو اس سے خود بخود اللہ کی محبت بڑھتی ہے اور مخلوق کی محبت گھٹتی ہے۔ مخلوق سے کٹتا ہے، اللہ سے جڑتا ہے۔ اس لیے اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید میں یہ فرمایا:

﴿وَاذْكُرِ اسْمَ رَبِّكَ﴾

''تو ذکر کر رب کے نام کا''

﴿وَتَبَتَّلْ إِلَيْهِ تَبْتِيلًا﴾ (المزمل:۸)

''اور رب کی طرف تبتل اختیار کر''

کیوں؟ اس لیے کہ رب ملتا ہی اس نام سے ہے۔ یہ جو مخلوق سے انقطاع ہے یہ ملتا ہی اللہ کے نام کے ذکر سے ہے۔ جتنا کثرت سے ذکر کریں گے مخلوق کی محبت نکلتی جائے گی اور اللہ کی محبت بڑھتی جائے گی۔

اب کوئی کہے کہ آپ کے رب کا کیا نام ہے تو کیا جواب دیں گے؟ اللہ۔ اب یہ جو فرمایا گیا ﴿وَ اذْكُرِ اسْمَ رَبِّكَ﴾ ''ذکر کر اپنے رب کے نام کا'' ذکر کرو گے تو کیا ملے گا؟ ﴿وَ تَبَتَّلْ اِلَيْهِ تَبْتِيْلًا﴾ مخلوق سے کٹو گے اللہ سے جڑو گے۔

اللہ کے ننانوے صفاتی نام ہیں سارے نام تخلق کے لیے ہیں اور یہ اللہ کا ذاتی نام ہے اور یہ نام تعلق کے لیے ہے۔ یہ جو فرمایا گیا کہ

((تَخَلَّقُوا بِاَخْلَاقِ اللّٰهِ)) (احیاء علوم الدین:۴/۳۰۶)

''اپنے آپ کو اللہ کے اخلاق سے مزین کرو''

تو صفاتی نام سب اس کے لیے ہیں۔ اور اللہ کا نام ذاتی نام ہے اور تعلق کے لیے ہے۔ اللہ سے جوڑنے کے لیے ہے۔

دائرۂ ایمان میں داخلہ کیسے؟

اس نام کی خوبی یہ ہے کہ اگر کوئی کافر یہ کلمہ پڑھے'' لَا اِلٰـهَ اِلَّا الرَّحْمٰن'' تو فتوی یہ ہے کہ وہ مسلمان نہیں ہوگا۔ کوئی بندہ کلمہ پڑھے'' لَا اِلٰـهَ اِلَّا الرَّحِيْم'' وہ مسلمان نہیں ہوگا۔ اس لیے کہ رؤف رحیم، سمیع، بصیر، سب صفاتی نام مخلوق کے ناموں میں استعمال ہو سکتے ہیں۔ اسے مسلمان تب کہیں گے جب وہ کہے گا'' لَا اِلٰـهَ اِلَّا اللّٰهُ''۔ جب وہ اللہ کا ذاتی نام لے گا۔ اب چونکہ ذاتی نام اور کسی کا ہو نہیں سکتا، یہ صرف اللہ ہی کی ذات کی طرف اشارہ کرتا ہے اور عَلَم ہے، اس لیے اب یہ کہا جائے

گا کہ یہ ایمان لایا ہے۔تمام غیر معبودوں کی اس نے نفی کر دی ہے، اب یہ مومن ہے۔

اسم ''اللہ'' کے معرفہ نہ ہونے میں حکمت:

اور عجیب بات یہ کہ یہ نام معرفہ بھی نہیں بن سکتا۔حالانکہ اس میں معرفہ کے تمام حروف ہیں۔ ''ا'' بھی ہے ''ل'' بھی ہے اور آخر پر ضمیر بھی ہے۔اتنے حروفِ معرفہ ہونے کے باوجود یہ معرفہ نہیں ہے۔معرفہ ہونے سے کیا مراد؟ کہ ایسا اسم جو اپنے مسمّٰی کی معرفت دے سکے۔تو معرفت تو یہ نہیں دے سکتا۔کوئی انسان اپنے اللہ کی ذات وصفات کو جان ہی نہیں سکتا۔

اب یہاں ایک سوال پیدا ہوا کہ جب یہ معرفت دے ہی نہیں سکتا تو پھر اللہ تعالیٰ نے نام کیوں رکھا؟ ہمارے مشائخ نے یہ فرمایا کہ نام اس لیے رکھا کہ اللہ تعالیٰ یہ چاہتے تھے کہ یہ نام اس لیے ہو کہ مجھے ماسوای سے جدا سمجھا جائے۔یہ نہیں ہے کہ اس نام سے اللہ کی کوئی معرفت مل جاتی ہے۔معرفہ سازوں کی کوئی فیکٹری اللہ تعالیٰ کی ذات کو معرفہ بنا ہی نہیں سکتی۔یہ جو کثرت سے معرفہ کے حروف لائے ہیں اس کا مقصد ہی یہ ہے کہ بھئی معرفہ بننا ہوتا تو ایک لفظ کافی تھا۔اور زیادہ ہوتا تو دو کافی تھے مگر یہ جو ''ہ'' ضمیر ہے یہ بھی معرفہ تھی مگر نہیں معرفہ بنا۔تو اس کا مطلب یہ ہے کہ تم جتنا زور لگا لو تم اس کی شان کی کنہ کو نہیں پہنچ سکتے۔

وَ هُوَ سُبْحَانَهُ وَ تَعَالٰى وَرَاءُ الْوَرَاءِ ثُمَّ وَرَاءُ الْوَرَاءِ ثُمَّ وَرَاءُ الْوَرَاءِ

ہمارے بزرگوں نے بہت کچھ سمجھنے کے بعد یہ کہا:

''جو کچھ دیکھا گیا، یا سنا گیا، یا جانا گیا (یعنی جس کو ہم سن سکتے ہیں، دیکھ سکتے یا علماً جان سکتے ہیں) سب اللہ کا غیر ہے، کلمہ لا کے نیچے لا کر سب کی نفی کرنی

چاہیے، اللہ کی شان بہت بلند ہے“

اللہ کے حبیب ﷺ جنہوں نے معراج کی رات اللہ رب العزت کا دیدار کیا، وہ فرماتے ہیں:

((مَا عَرَفنَاكَ حَقَّ مَعرِفَتِكَ)) (تفسیر روح المعانی)

”ہم آپ کی معرفت حاصل نہ کر سکے جیسے حق تھا“

پھر ہم کس کھیت کی گاجر مولی ہیں۔ یعنی ”اللہ“ کا لفظ ہے جو اللہ کو ماسوا سے ممتاز کر دیتا ہے۔ اتنا پتہ چل جاتا ہے کہ جس کی بات ہو رہی ہے وہ مخلوق نہیں ہے، وہ خالق ہے۔

اسمِ ذات کے ذکر سے ذات کی محبت پیدا ہوتی ہے:

اللہ کی شان دیکھیے! اللہ نے اسم ذات کو ایسا بنایا کہ اس نام کا بار بار ذکر کرنے سے اس کی ذات کی محبت پیدا ہوتی ہے۔

مثال کے طور پر آپ سب بیٹھے ہیں، میں آپ کو کہوں کہ ونیلا فلیور آئس کریم ایسی ہوتی ہے، چاکلیٹ فلیور ایسی ہوتی ہے، سب کے منہ میں پانی آجائے گا۔ کیوں؟ پہلے تو خیال بھی نہیں تھا، اب پانی کیوں آرہا ہے؟ اس لیے کہ اس کا ذکر جو ہوا۔ تو ذکر سے ذات کی محبت پیدا ہوتی ہے، یہ دستور ہے۔ ہم جب کثرت سے اللہ کا ذکر کریں گے تو اللہ کی محبت آئے گی۔ پاک ہے وہ ذات کہ ایک طرف تو فرما دیا:

﴿اذْكُرُوا اللَّهَ ذِكْرًا كَثِيرًا﴾ (الاحزاب:۴۱)

”اللہ کا ذکر کثرت سے کرو“

اللہ تعالیٰ جانتے تھے کہ اِدھر کریں گے ذکر کی کثرت اور اُدھر ان کو ملے گی محبت کی شدت۔ اس لیے فرما دیا:

﴿وَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اَشَدُّ حُبًّا لِّلّٰهِ﴾ (البقرة:١٦٥)

''جو ایمان والے ہیں وہ اللہ سے شدید محبت کرتے ہیں''

کیا جوڑ بنا دیا کہ تم اس کے ذکر کی کثرت کرلو تمہیں محبت کی شدت مل جائے گی۔ آج کوئی کہے کہ مجھے محبت کی شدت محسوس نہیں ہوتی، اس کا سیدھا سادھا جواب یہ ہے کہ آپ ذکر کی کثرت ہی نہیں کرتے۔ کوئی بندہ تو ایسا دکھائیں کہ اس نے ذکر کی کثرت کی ہو اور اسے محبت کی شدت نہ ملی ہو۔ ایک مثال ایسی نہیں دے سکتے۔ ذکر کی کثرت سے اللہ کی محبت انسان کے دل میں بڑھ جاتی ہے۔ حتیٰ کہ انسان اللہ کا متوالا، اللہ کا دیوانہ بن جاتا ہے۔

کلمہ طیبہ کے ذکر کی فضیلت:

ربِ کریم نے دین میں داخل ہونے کے لیے ہمیں کلمہ دیا۔

لَآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰهِ

لَآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ کا الوہیت کے ساتھ تعلق ہے، اگلے حصے کا رسالت کے ساتھ۔

ایک دفعہ موسیٰ علیہ السلام نے کہا: اے اللہ! مجھے وہ چیز پڑھنے کے لیے بتایئے جو سب سے ممتاز ہو۔

فرمایا کہ لَآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ پڑھا کرو۔

کہا: یہ تو ساری دنیا پڑھتی ہے۔

فرمایا: اے میرے پیارے موسیٰ علیہ السلام اگر ساتوں زمینیں ساتوں آسمان ایک پلڑے میں رکھ دیے جائیں اور دوسرے پلڑے میں لَآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ تو لَآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ کا پلڑا جھک جائے گا۔ یہ لَآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ کا کہنا چھوٹی بات نہیں ہے۔

(کنز العمال، رقم:١٦١)

معبودانِ باطلہ:

لَآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ ہے کیا؟ یہ باطل معبودوں کی نفی کا نام ہے۔ باطل معبود دو طرح کے ہوتے ہیں۔

(۱) آفاقی معبود:

ایک ہوتے ہیں آفاقی معبود۔ یعنی انسان کے باہر کے معبود۔ جیسے کوئی بت بنا کر رکھنا اور اس کی پوجا کرنا۔ جیسے لات، منات، عزیٰ، اس طرح کے بت بنا کر رکھنا اور ان کی پوجا کرنا، ہندوؤں کی طرح پیپل کے درخت کی پوجا کرنا، قبروں کو سجدے کرنا۔ یہ سب باطل معبود ہیں۔ تو جتنے انسان کے باہر اصنام ہیں ان سب کو کہتے ہیں: آفاقی معبود۔

(۲) انفسی معبود:

اور کچھ معبود انسان کے اندر ہوتے ہیں، جیسے انسان کا نفس ہے، خواہشات ہیں۔ اس کی مثال قرآن مجید میں ملتی ہے، اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتے ہیں:

﴿اَفَرَاَیْتَ مَنِ اتَّخَذَ اِلٰهَهٗ هَوٰیهُ﴾ (الجاثیۃ:۲۳)

''کیا دیکھا آپ نے اس کو جس نے اپنی خواہشات کو اپنا معبود بنالیا''

یعنی وہ اپنی خواہشات کی پوجا کرتا ہے۔ تو اس کو کہتے ہیں: انفسی معبود۔

چنانچہ کسی کو مال کی محبت ایسی ہے کہ وہ زکوٰۃ ہی نہیں دیتا۔ تو وہ مال کی پوجا کرتا ہے، یہ ہوا زر پرست۔ کسی کو کسی غیر محرم عورت سے ایسی محبت ہے کہ غیر شرعی تعلق قائم کرلیا اور حکمِ خدا کو پست پشت ڈال دیا تو یہ ہوا ''زن پرست''۔ اسی طرح شہوت پرست اور بت پرست۔ خدا پرستی تو کوئی اور چیز ہوتی ہے۔

ایمانِ کامل کے لیے معبودانِ باطلہ کی نفی ضروری ہے:

اس لیے جب تک انسان آفاقی اور انفسی ہر طرح کے معبودوں کی نفی نہیں کرے گا، ایمانِ کامل والا نہیں بنے گا۔ آفاقی معبودوں کی پوجا کرنے کو ''شرکِ جلی'' کہتے ہیں اور انفسی معبود کی پوجا کرنے کو ''شرکِ خفی'' کہتے ہیں۔ وہ بھی مشرک ہے اور یہ بھی مشرک۔ وہ کھلم کھلا مشرک ہے، یہ چھپا ہوا مشرک ہے۔ اُس نے بتوں کو شریک بنایا، اس نے نفس کو اللہ کے ساتھ شریک بنا لیا۔ شرک سے نکلے گا تو ایمان کی حدوں میں آئے گا۔ اس لیے اگر ہم چاہتے ہیں کہ ہمارا ایمان کامل ہو جائے، اللہ کے ہاں مقبول ہو جائے تو

بتوں کو توڑ تخیل کے ہوں یا پتھر کے

سارے بتوں کو توڑنا پڑے گا۔ چاہے وہ پتھر کے ہوں، یا من میں کوئی مورت گھسی بیٹھی ہو، اگر لڑکی کو میسج کرتا ہے، فون کرتا ہے، باتیں کرتا ہے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ اس نے اس کو اپنا معبود بنایا ہوا ہے۔

معبودانِ باطلہ کی نفی کا طریقہ:

اب ایسی کیفیت کیسے مل جائے کہ دونوں معبودوں سے انسان کی جان چھوٹ جائے۔ ہمارے مشائخ نے اس کا آسان حل بتایا کہ دیکھو! تم کلمہ پڑھو اور ظاہری معبودوں کی نفی تو فوراً کر دو۔ اب اگلی بات رہ گئی جو باطن کے معبود ہیں، انفس کے معبود ہیں، ان کے لیے تمہیں ذکر کرنا پڑے گا۔ ''اللہ اللہ'' کا ذکر کرنا پڑے گا، ''لَآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهَ'' کا ذکر کرنا پڑے گا۔ ''اللہ اللہ'' کا لفظ بھی ایسا ہے اور ''لَآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ'' کا ذکر بھی ایسا ہے کہ جھاڑو پھیرتا جاتا ہے۔ جیسے جھاڑو پھیر دیتے ہیں تو جگہ صاف ہو

جاتی ہے۔ یہ ''لَآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ'' کا ذکر بالکل دل پر جھاڑو پھیر دیتا ہے۔

عشق کی آتش کا جب شعلہ اٹھا
ما سوا معشوق سب کچھ جل گیا
تیغِ لا سے قتلِ غیرِ حق ہوا
دیکھیے پھر بعد اس کے کیا بچا؟
پھر بچا اللہ باقی سب فنا
مرحبا اے عشق! تجھ کو مرحبا

یہ ''لَآ اِلٰـهَ اِلَّا اللّٰـهُ'' کی تلوار ایسی ہے کہ یہ جب چلتی ہے تو اللہ کے سوا جتنے معبود ہیں، نفسی یا آفاقی، سب کو کاٹ کر رکھ دیتی ہے۔ اس لیے ہمارے مشائخ کہتے ہیں: کلمہ کا ذکر تین ہزار دفعہ کرو، پانچ ہزار دفعہ کرو، چلتے پھرتے لا'' اِلٰـهَ اِلَّا اللّٰـهُ'' پڑھو۔

نفی کامل کی محنت:

اچھا! ہمیں نفی کامل حاصل نہیں ہے۔ آپ ذرا غور کریں! ہم جتنے یہاں بیٹھے ہیں۔ چاہے مفتی ہیں، چاہے حدیث پڑھاتے ہیں، چاہے خلیفہ صاحب ہیں، چاہے پیر صاحب ہیں۔ ہم ذرا دل میں یہ غور کریں کہ کیا واقعی ہمیں معبودوں کی نفی کامل حاصل ہے؟ یا ہم کسی نہ کسی کی پرستش میں پھنسے ہوئے ہیں۔ تو دل جواب دے گا کہ ہم سے تو آنکھ قابو ہی نہیں ہوتی۔ تو اللہ کی بجائے نفس کی پوجا زیادہ کی۔ جھوٹ بولا تو نفس کی چاہت پوری کی، خدا کے بجائے۔ اسی طرح اور خلافِ شرع کاموں میں بھی...... اس کا مطلب ہے کہ ابھی جان نہیں چھوٹی ہماری۔ تو یہ جان کب چھوٹے

گی؟ اس کے لیے محنت کرنی پڑے گی۔ محنت کریں گے تو یہ من ایسا صاف ہو جائے گا کہ اس کے بعد انسان ہر کام اللہ کی رضا کے لیے کرے گا۔

حضرت خواجہ ابوالحسن خرقانی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ میں قسم اٹھا کر کہتا ہوں کہ میں نے زندگی کے تہتر سال ایسے گزارے ہیں کہ میرے دل میں اللہ کی یاد کے سوا کوئی نہیں تھا۔ ایسی زندگیاں بھی گزار کر گئے ہیں ہمارے بزرگ کہ ہر کام اللہ کے لیے:

﴿قُلْ اِنَّ صَلٰوتِیْ وَ نُسُکِیْ وَ مَحْیَایَ وَ مَمَاتِیْ لِلّٰہِ رَبِّ الْعَالَمِیْنَ﴾

(الانعام:۱۶۲)

''کہہ دو کہ میری نماز اور میری عبادت اور میرا جینا اور میرا مرنا، سب خدائے رب العالمین کے لیے ہے''

ہم تو بہت دور پھر رہے ہیں۔ بھئی! ہمیں تو اپنے من کی صفائی کی بہت ضرورت ہے۔

حقیقتِ ابراہیمی اور حقیقتِ محمدی میں فرق:

اب یہاں پر میں آپ کو ایک علمی نکتہ سنا کر بات کو ختم کرتا ہوں۔ ہمارے سلسلے میں اسباق ہیں...... یہ مراقبۂ معیت ہے، یہ ولایت صغریٰ، یہ ولایت کبریٰ، یہ ولایت ملأ اعلیٰ ہے۔ پھر حقائق کے اسباق ہوتے ہیں، تو ان حقیقتوں میں ایک ہے ''مراقبہ حقیقتِ ابراہیمی''، اور ایک ہے ''مراقبۂ حقیقتِ محمدی''۔ ان سے بعض دفعہ سالکین حیران ہوتے ہیں کہ یہ حقیقت سے کیا پتہ چلتا ہے؟ ''مراقبۂ حقیقتِ ابراہیمی'' کیا ہے؟ ''مراقبہ حقیقتِ محمدی'' کیا ہے؟ تو یہ کیا فرق ہے، یہ بات ذہن میں آتی ہے۔ تو ایک چھوٹا سا فرق عرض کر دوں۔

سیدنا ابراہیم علیہ السلام کا کمالِ نفی:

سیدنا ابراہیم علیہ السلام کو اللہ رب العزت نے نفی میں کمال عطا کیا تھا۔ لَا اِلٰـهَ کے اندر کمال عطا کیا تھا، اس کو نفی کہتے ہیں۔ ساری دنیا کے انہوں نے بت توڑ دیے تھے۔

﴿فَجَعَلَهُمْ جُذٰذًا اِلَّا كَبِيْرًا﴾ (الانبیاء:۵۸)

گھر کو چھوڑ دیا تھا، قوم کو چھوڑ دیا تھا، کہا تھا کہ میں ان سب سے بری ہوں۔ حتیٰ کہ جب ان کو آگ میں ڈالا گیا، اس وقت جب آگ میں ابھی گئے نہیں تھے، راستے میں تھے، تو اس وقت حضرت جبرئیل علیہ السلام اللہ کے حکم سے تشریف لائے اور آ کر پوچھا:

اَلَكَ حَاجَةٌ؟ ''اے ابراہیم علیہ السلام! کیا آپ کو میری حاجت ہے؟''

تو ابراہیم علیہ السلام نے جواب دیا کہ یہ بتاؤ:

''کیا اللہ تعالیٰ مجھے اس حال میں دیکھتے ہیں؟''

انہوں نے کہا: ہاں دیکھتے ہیں۔ تو وہ کہنے لگے:

''حَسْبِیْ مِنْ سُوَالِیْ عِلْمُهٗ بِحَالِیْ'' (مرقاۃ المفاتیح:۱۵/۱۶۸)

''اس بات نے مجھے تجھ سے سوال کرنے سے روک لیا کہ میرا مولا جانتا ہے کہ میں کس حال میں ہوں؟''

جب اللہ رب العزت مجھے اس حال میں دیکھ رہے ہیں تو اس وجہ سے اب مجھے تم سے سوال کرنے کی کوئی ضرورت نہیں۔ جب اللہ جانتے ہیں کہ میں اس حال میں ہوں تو پھر مجھے کیا ضرورت ہے سوال کرنے کی؟ یعنی عالمِ ناسوت کے اسباب کی بھی نفی کر دی اور عالمِ ملکوت کے اسباب کی بھی نفی کر دی۔ اس کو کہتے ہیں ''نفیِ کامل''۔ تو نفیِ کامل جن کو حاصل تھی وہ حضرت ابراہیم علیہ السلام تھے۔ ان کو اللہ نے پھر خُلّت کا تاج

پہنا دیا۔

حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کا کمالِ نفی واثبات:

پھر اللہ رب العزت نے اپنے پیارے حبیب حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو بھیجا۔ اللہ کے پیارے حبیب صلی اللہ علیہ وسلم کو نفی میں بھی کمال حاصل تھا اور اثبات میں بھی کمال ملا۔ اس بات میں اب آپ یہ نہیں کہیں گے کہ ابراہیم علیہ السلام کو نفی میں کمال تھا تو اثبات بھی تو وہ کرتے تھے اِلَّا اللّٰہ بھی کہتے تھے۔ اثبات تو وہ کرتے تھے لیکن اثبات میں جو کمال تھا وہ نہیں تھا۔ کیونکہ سیدنا ابراہیم علیہ السلام کا جو ایمان تھا وہ غیبی تھا، شہودی نہیں تھا۔ بن دیکھے تھا، دیکھا ہوا نہیں تھا۔ تو دیکھا ہوا اور بن دیکھے برابر تو نہیں ہوسکتا۔

نبی علیہ السلام کو اللہ نے یہ سعادت بخشی کہ آپ اس دنیا میں تشریف لائے۔ آپ نے اس دنیا میں باطل معبودوں کی نفی میں بھی کمال حاصل کیا اور پھر اللہ تعالیٰ نے معراج کے ذریعے اِلَّا اللّٰـهُ والا جو اثبات کا مقام تھا، اس میں آپ کو شہودی ایمان عطا فرمایا تھا۔ اب یہ نعمت کسی اور پیغمبر کو نہیں ملی۔ ابراہیم علیہ السلام کو آدھا کمال ملا اور نبی علیہ السلام کو پورا کمال ملا۔ اس لیے اللہ رب العزت نے ان کو اپنے حبیب ہونے کا تاج پہنایا کہ یہ میرے محبوب ہیں، ان کو نفی میں بھی کمال حاصل ہے اور اثبات میں بھی کمال حاصل ہے۔ اس کے باوجود نبی علیہ السلام کے دل میں یہ تمنا رہتی تھی کہ یا اللہ! نفی میں جو کمال ابراہیم علیہ السلام کو ملا تھا وہ بھی مجھے ملے۔ اس لیے نبی علیہ الصلوٰۃ والسلام نے فرمایا کہ تم مجھ پر یہ درود پڑھا کرو:

((اَللّٰهُمَّ صَلِّ عَلٰى مُحَمَّدٍ وَّعَلٰىٓ اٰلِ مُحَمَّدٍ كَمَا صَلَّيْتَ عَلٰىٓ اِبْرَاهِيْمَ)) (صحیح البخاری: ۳۱۱۹)

اب سمجھ میں آئی کہ کون سی وہ نعمت تھی جو ابراہیم علیہ السلام کے پاس تھی اور نبی علیہ السلام اس کی خواہش کیا کرتے تھے اور دعا مانگتے تھے۔

کلمہ طیبہ کی کثرت سے دل کی صفائی:

یہ کلمہ ہے تو چھوٹا سا لَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ مگر اس کی معرفت عجیب ہے۔ اور جو بندہ کثرت کے ساتھ اس کو پڑھتا ہے، اس کے دل کو اللہ تعالیٰ ایسے صاف کر دیتے ہیں جیسے کسی چیز پر جھاڑو پھیر دیا ہو۔ اب آپ سوچیں ہم دن میں کتنا کلمہ پڑھتے ہیں۔ شاید کئی دن ہی گزر گئے ہوں گے کلمے پڑھے ہوئے۔ یا پڑھتے بھی ہوں گے تو دس بیس دفعہ، اس سے زیادہ تو نہیں۔ عام دستور تو یہی ہے۔ تو ہم اپنے دل کی صفائی کے لیے کر بھی تو کچھ نہیں رہے تو پھر اثرات کیسے ہوں؟ ایمان کی حلاوت کیسے ملے؟ لذت کیسے ملے؟ تو ہمیں چاہیے کہ ہم اللّٰہ اللّٰہ والے ذکر کی بھی کثرت کریں۔ اور لَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ والا ذکر بھی کثرت کے ساتھ کریں۔ پھر دیکھیں کہ دل میں ایمان کیسے آتا ہے؟ آپ ہی ہوں گے جو گناہوں سے بچنے پر خوش ہو رہے ہوں گے کہ الحمد للہ مجھے اللہ نے اس گناہ سے بچنے کی توفیق عطا کر دی۔ اسے ایمان کی حلاوت کہتے ہیں کہ بندہ گناہوں سے بچتا ہے اور اللہ کا شکر ادا کرتا ہے۔

زندگی کا رخ بدلنے کی ضرورت:

عزیز طلبا! آپ حضرات کی زندگی دین کے راستے پر گزر رہی ہے۔ آپ منزل کے بہت قریب ہیں۔ کیونکہ آپ اللہ کے لیے بہت کچھ چھوڑ چکے۔ اس دور میں دینی وضع قطع کو اختیار کر لینا، مسجد میں رہنا، مدرسے میں رہنا، دین کو پڑھنا بڑی قربانیاں چاہتا ہے۔ آپ کی قربانیاں تو بہت ہیں۔ اب تھوڑی سی قربانی اور دینے والی بات

ہے۔ کئی دفعہ چیزیں چھوٹی ہوتی ہیں مگر رخ موڑنے میں بڑی تاثیر رکھتی ہیں۔

آپ نے ریلوے کا نظام دیکھا ہے؟ اس میں ایک کانٹا ہوتا ہے۔ اتنی بڑی ریل گاڑی آرہی ہے، اگر کانٹا نہیں بدلا تو سیدھی چلی جائے گی اور اگر کانٹا بدل دیا تو دوسرے لائن پر چلی جائے گی۔ اور وزن کے حساب سے دیکھیں تو وہ کانٹا کلو کا بھی نہیں ہوتا اور سینکڑوں ٹن وزنی گاڑی کا رخ پھیر دیتا ہے۔ حال ہمارا یہی ہے کہ ہم نے اتنا کچھ اللہ کے لیے چھوڑا لیکن وہ جو تھوڑا سا مسئلہ رہ گیا ہے۔ بدنظری ہے، شہوانی خیالات ہیں، ان سے سچی توبہ نہ کرنے کی وجہ سے ہمارا کانٹا نہیں بدلتا۔

تو ہمیں چاہیے کہ ہم ان بقیہ گناہوں سے بھی آج کی رات سچی توبہ کرلیں اور اللہ سے مدد مانگیں۔ اگر شیطان کان میں آکر مشورہ دے کہ تو گناہوں کو نہیں چھوڑ سکتا تو شیطان کو بتائیں کہ ہم گناہوں کو نہیں چھوڑ سکتے مگر ہمارا رب تو چھڑا سکتا ہے۔ تو اللہ کی مدد پر نظر رکھیں اور اس کے لیے دعا مانگیں۔ گناہوں سے بچنے کے لیے جو اللہ سے مدد مانگتا ہے، اللہ کی مدد اپنے اس بندے پر لازمی آتی ہے۔ روئیں دھوئیں اللہ کے آگے، اللہ کی مدد مانگیں، اللہ تعالیٰ ایمان کی حلاوت عطا فرمائیں گے۔ اگر ایمان کی حلاوت نصیب ہوگئی تو آپ کے سارے مسئلے حل ہو جائیں گے، کیوں کہ پھر اللہ خزانوں کے دروازے کھول دیتا ہے۔

﴿وَلَوْ اَنَّ اَهْلَ الْقُرٰی اٰمَنُوْا وَاتَّقَوْا لَفَتَحْنَا عَلَیْهِمْ بَرَكٰتٍ مِّنَ السَّمَآءِ وَ الْاَرْضِ﴾ (الاعراف:۹۶)

''اگر ان بستیوں والے ایمان لاتے اور تقویٰ اختیار کرتے تو ہم آسمان اور زمین سے برکتوں کے دروازے کھول دیں گے''

ان برکتوں کے دروازوں کو ہم خود کھلنے نہیں دیتے۔ کنڈی لگائے بیٹھے ہیں۔

گناہ کی رسیوں سے کامل آزادی:

اگر ایک جانور ہو، اسے کسی نے دو تین رسیوں سے باندھ دیا ہو اور آپ آ کر ایک رسی کھول دیں تو وہ کھلا تو نہیں کہلائے گا۔ اچھا! کوئی دوسری رسی بھی کھول دے تو بھی وہ کھلا نہیں کہلائے گا۔ وہ تو تب کھلے گا جب تیسری رسی بھی کھول دی جائے۔ اسی طرح گناہ رسیاں ہیں جنہوں نے ہمیں باندھا ہوا ہے۔ اب سو رسیوں سے بندھے ہوئے ہیں، ایک گناہ چھوڑ دیا، دوسرا چھوڑ دیا، تیسرا، چوتھا...... اب پچانوے بھی چھوڑ دیے تو پانچ گناہوں سے بندھے ہوئے ہیں۔ ہم تو گرفتار ہی کہلائیں گے، آزاد تو نہیں کہلائیں گے۔ اس لیے ہر گناہ سے سچی توبہ کرنے کی ضرورت ہے۔

﴿تُوبُوٓا اِلَى اللّٰهِ تَوْبَةً نَّصُوْحًا﴾

اس لیے ایک مشورہ ہے کہ صرف ایک مرتبہ ساری رسیوں کو چھڑوا کر اللہ کے فرمانبردار بندوں میں نام لکھوالیں۔ پکی نیت کے ساتھ سارے گناہوں سے سچی توبہ کرلیں۔ کوئی تو دن ایسا ہو کہ ہم یہ پکی نیت کرلیں کہ اللہ ہم نے آج تیری نافرمانی نہیں کرنی۔ زندگی کے کچھ گھنٹے ایسے گزارلیں، کوئی زندگی کا پہر ایسا گزاریں، کوئی دن، کوئی رات، کوئی ہفتہ، کوئی مہینہ تو ایسا گزرے کہ جس میں انسان کہے کہ اس میں میں نے کوئی گناہ نہیں کرنا۔ ایک دن بھی ایسا گزر جائے تو اس کی برکت سے اللہ تعالیٰ آنے والے مہینوں اور سالوں کو نیکی میں بدل دیں گے۔ اس لیے یہ کرنے والا کام ہے۔

اللہ کی سرپرستی میں آئیے:

ہمیں چاہیے کہ ہم تمام گناہوں سے سچی پکی توبہ کرلیں اور اللہ کے فرمانبردار

بندوں میں نام لکھوا لیں۔ ورنہ تو فرمانبرداروں میں نام ہی نہیں لکھا جائے گا۔ ساری زندگی نافرمانوں میں ہی نام رہے گا۔ اتنا ہی فرق ہے کہ دنیاداروں نے سو گناہ کیے اور ہم نے دو گناہ کیے۔ ہیں وہ بھی گناہ گار اور ہیں ہم بھی گناہگار۔ رہے وہ بھی منزل سے دور اور رہے ہم بھی منزل سے دور۔ ؎

حسرت ہے اس مسافرِ مضطر کے حال پر
جو تھک کر رہ گیا ہو منزل کے سامنے

الحمدللہ! ہم جو مدرسوں کی زندگی گزارنے والے ہیں، مساجد کی زندگی گزارنے والے ہیں۔ اللہ رب العزت نے ہمیں پہلے ہی منزل کے قریب پہنچا دیا ہے۔ اب آگے زیادہ لمبا چوڑا مسئلہ نہیں ہے۔ چھوٹا سا ہی مسئلہ ہے اور وہ اندر کا روگ ہے۔ اگر ہم دل سے یہ کہہ دیں:

''دلوں من لئی تیری بن گئی''

''اے اللہ! میں نے یہ دل سے مان لیا کہ میں تیرا بن گیا۔''

پھر دیکھیں اللہ حلاوت بھی دیں گے، اللہ استقامت بھی دیں گے، اللہ عزت بھی دیں گے، اللہ دنیا کے اندر ہماری مدد بھی فرمائیں گے، ہر چیز ہماری ہو گی۔ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿وَ اللّٰهُ وَلِيُّ الْمُؤْمِنِيْنَ﴾ (آلِ عمران:۶۹)

''اللہ ایمان والوں کا سرپرست ہے''

آپ بچے ہیں اگر کوئی جھگڑا ہو جائے تو لوگ باپ کے پاس جاتے ہیں یا نہیں؟ کیوں؟ سرپرست جو ہے آپ کا، مدد کو تو پھر وہی آتا ہے۔ مقدمہ ہو جائے تو باپ آتا ہے، کوئی فیس بھرنی ہو تو باپ آتا ہے، کیوں بھاگا پھرتا ہے؟ اس لیے کہ سرپرست جو

ہے۔اسی طرح انسان جب ایمانِ کامل حاصل کر لیتا ہے تو اللہ تعالیٰ اس کا سرپرست بن جاتا ہے۔اور جس کا سرپرست اللہ بن جائے تو پھر سبحان اللہ! اللہ رب العزت ہمیں پاکیزہ زندگی گزارنے کی توفیق نصیب فرمائے۔

﴿وَاٰخِرُ دَعْوٰنَا اَنِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ﴾

﴿وَاتَّقُوا اللّٰهَ وَيُعَلِّمُكُمُ اللّٰهُ﴾

(البقرۃ:۲۸۲)

علمِ نافع کا حاصل تقویٰ اور توکل

بیان: محبوب العلماوالصلحا، زبدۃ السالکین، سراج العارفین
حضرت مولانا پیر ذوالفقار احمد نقشبندی مجددی دامت برکاتہم

تاریخ: 10 فروری 2012ء بروز جمعہ ۱۷ ربیع الاوّل ۱۴۳۳ھ

موقع: بیان جمعۃ المبارک

مقام: جامع مسجد زینب معہد الفقیر الاسلامی جھنگ

اقتباس

ذہن میں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ علمِ نافع کیا ہے؟ تو ہمارے بزرگوں نے اس کی تفصیل بتائی ہے، اس کی پہچان بتائی ہے......علمِ نافع کی ایک پہچان تو یہ ہے کہ بندے کے اندر خوف (تقوٰی) بڑھتا ہے۔فرمایا:

كُلَّمَا ازْدَادَ عِلْمًا، اِزْدَادَ خَوْفًا

''جتنا علم بڑھتا جائے اتنا اللہ کا خوف بھی بڑھتا جائے''

خوفِ خدا پیدا ہونا یہ علم نافع کی پہچان ہے۔اور اگر علم تو بڑھتا جارہا ہے،خوفِ خدا نہیں بڑھ رہا تو اس کا مطلب ہے کہ یہ علمِ نافع نہیں ہے۔ جتنا علم بڑھے اتنا اللہ کا خوف بھی بڑھے گا، اور جتنا خوف بڑھے گا اتنا معصیت سے بچے گا۔

(حضرت مولانا پیر ذوالفقار احمد نقشبندی مجددی مدظلہ)

علمِ نافع کا حاصل......تقوای اور توکل

اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ وَكَفٰى وَسَلَامٌ عَلٰى عِبَادِهِ الَّذِيْنَ اصْطَفٰى اَمَّا بَعْدُ:
فَاَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطٰنِ الرَّجِيْمِ ٥ بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ ٥
﴿بَلْ تُؤْثِرُوْنَ الْحَيٰوةَ الدُّنْيَا ٥ وَالْاٰخِرَةُ خَيْرٌ وَّ اَبْقٰى ٥ اِنَّ هٰذَا لَفِى الصُّحُفِ الْاُوْلٰى ٥ صُحُفِ اِبْرَاهِيْمَ وَمُوْسٰى﴾ (الاعلیٰ:۱۶،۱۷)
سُبْحَانَ رَبِّكَ رَبِّ الْعِزَّةِ عَمَّا يَصِفُوْنَ ٥ وَسَلَامٌ عَلَى الْمُرْسَلِيْنَ ٥
وَالْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ٥
اَللّٰهُمَّ صَلِّ عَلٰى سَيِّدِنَا مُحَمَّدٍ وَّعَلٰى اٰلِ سَيِّدِنَا مُحَمَّدٍ وَّبَارِكْ وَسَلِّمْ

دین اور دنیا کا دوراہا:

انسان کو اس دنیا میں کئی ایسے مواقع پیش آتے ہیں کہ جہاں ایک طرف دنیا اسے اپنی طرف بلا رہی ہوتی ہے، دوسری طرف اللہ رب العزت اپنی طرف بلا رہے ہوتے ہیں۔ یہ ایک دوراہا ہوتا ہے۔ ایک طرف جائے تو اللہ ملتا ہے، دوسری طرف جائے تو دنیا کی لذتیں اور رنگینیاں ملتی ہیں۔ بہت کم لوگ ایسے ہوتے ہیں جو ایسے موقع پر دنیا کی رنگینیوں کو چھوڑ کر، اس سے منہ موڑ کر اللہ کی طرف متوجہ ہوتے ہیں۔ آج کل طبیعتیں اس قدر لذات کی خوگر ہو چکی ہیں کہ ہر بندہ آسانی اور لذت کے پیچھے بھاگتا ہے۔ ایک عام ابتلا یہ ہے کہ

﴿يٰلَيْتَ لَنَا مِثْلَ مَآ اُوْتِىَ قَارُوْنُ﴾ (القصص:۷۹)

اے کاش! ہمارے پاس بھی اتنا مال ہوتا جتنا قارون کے پاس تھا۔

اہلِ علم کا راستہ:

اس وقت بھی جو اہل علم تھے، انہوں نے کہا:

﴿قَالَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْعِلْمَ وَيْلَكُمْ﴾ (القصص:۸۰)

''اہلِ علم نے کہا: تمہاری بربادی ہو''

تمہارا ناس ہو، تمہاری مت ماری گئی تم آخرت کو بھول کر دنیا کی چیز مانگتے ہو۔ آج بھی وہی اصول اپنی جگہ قائم ہے کہ جو صاحبِ علم ہوگا، جس کے سینے میں علم کا نور اتر چکا ہوگا، وہ ہمیشہ دین کو پسند کرے گا، ہمیشہ آخرت کو پسند کرے گا۔ اللہ تعالیٰ قرآن مجید میں ارشاد فرماتے ہیں:

﴿بَلْ تُؤْثِرُوْنَ الْحَيٰوةَ الدُّنْيَاo وَالْاٰخِرَةُ خَيْرٌ وَّ اَبْقٰىo﴾

(الاعلیٰ:۱۶، ۱۷)

''تم دنیا کی زندگی کو ترجیح دیتے ہو اور آخرت کی زندگی اس سے بہتر اور باقی رہنے والی ہے''

تو یہ ذہن بنالیں جہاں دین اور دنیا آپس میں آمنے سامنے آئیں، تو ہم دین کو مقدم کریں۔ جہاں بھی نیکی اور معصیت آپس میں آمنے سامنے آئیں تو آپ نے نیکی کو ترجیح دینی ہے۔ اگر یہ دو چیزیں آپ نے اپنے اندر پیدا کرلیں تو اپنے اللہ کی مدد کو اپنے ساتھ لے لیا۔ اس لیے فرمایا:

((اِيْثَارُ الدِّيْنِ عَلَى الدُّنْيَا وَ اِيْثَارُ الطَّاعَةِ عَلَى الْمَعْصِيَةِ))

''دین کو دنیا پر ترجیح دے اور اطاعت کو معصیت پر ترجیح دے''

علمِ نافع کیا ہے؟

اور یہ چیز ''علمِ نافع'' کے بغیر حاصل نہیں ہوسکتی۔ اس لیے انسان اللہ تعالیٰ سے

علمِ نافع مانگے۔ علمِ نافع یعنی نفع دینے والا علم، ایسا علم جو سینے میں اتر جاتا ہے تو سینے کو دین کے لیے کھول دیتا ہے۔ پھر انسان کے لیے دین پر چلنا مشکل نہیں ہوتا، دین پر چلنا آسان ہو جاتا ہے۔ ذہن میں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ علمِ نافع کیا ہے؟ تو ہمارے بزرگوں نے اس کی تفصیل بتائی ہے، اس کی پہچان بتائی ہے۔

علمِ نافع اور تقویٰ

علمِ نافع کی ایک پہچان تو یہ ہے کہ بندے کے اندر خوف (تقویٰ) بڑھتا ہے۔ فرمایا: م

كُلَّمَا ازْدَادَ عِلْمًا، اِزْدَادَ خَوْفًا

''جتنا علم بڑھتا جائے اتنا اللہ کا خوف بھی بڑھتا جائے''

خوفِ خدا پیدا ہونا یہ علم نافع کی پہچان ہے۔ اور اگر علم تو بڑھتا جا رہا ہے، خوفِ خدا نہیں بڑھ رہا تو اس کا مطلب ہے کہ یہ علمِ نافع نہیں ہے۔ جتنا علم بڑھے اتنا اللہ کا خوف بھی بڑھے گا، اور جتنا خوف بڑھے گا اتنا معصیت سے بچے گا۔

اس لیے امام غزالی رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا کہ بڑا عالم وہ نہیں ہوتا جو باتیں زیادہ کرنا جانتا ہے بلکہ بڑا عالم وہ ہوتا ہے جس پر معصیت کے نقصانات زیادہ کھل چکے ہوں اور وہ معصیت سے بچنے کی کوشش کرتا ہو۔ جتنا معصیت کے نقصانات کھلتے جائیں گے، اتنا انسان معصیت سے پیچھے ہٹتا جائے گا کیونکہ وہ اس کے نقصانات سے واقف ہے۔ وجہ یہی ہے کہ

كُلَّمَا ازْدَادَ عِلْمًا، اِزْدَادَ خَوْفًا

''جتنا انسان کا علم بڑھے انسان کا خوف بھی بڑھ جائے''

اب ہمیں یہ ایک تھرمامیٹر مل گیا، یہ پیمائش کرنے کے لیے کہ ہمارا علم، علمِ نافع ہے یا نہیں؟ ہم اپنی زندگی کو دیکھیں کہ اس میں خوفِ خدا کتنا ہے؟

خوف گناہوں کو چھڑوا دیتا ہے:

جب انسان کے دل میں خوف ہوتا ہے تو انسان گناہوں کو چھوڑ دیتا ہے۔ اس لیے ایک لفظ ہے ''حزن'' وہ اندر کے غم کے لیے استعمال ہوتا ہے، ایک ہے ''خوف'' یہ باہر کے ڈر کے لیے استعمال ہوتا ہے۔ جب حزن بڑھتا ہے تو انسان کا کھانا پینا چھوٹ جاتا ہے، دل ہی نہیں کرتا کھانے پینے کو۔ آپ خود سمجھیں! طالب علم فیل ہو جائے یا جس طالب علم کو توقع ہو کہ میں کلاس میں فرسٹ آؤں گا اور اس کی وہ پوزیشن نہ آئے تو دل بجھ جاتا ہے، طبیعت کچھ کرنے کو نہیں چاہتی۔ جس ماں کا بیٹا فوت ہو جائے، کئی مہینے کھانے کو دل نہیں کرتا۔ جوان عورت کا خاوند فوت ہو جائے، لقمہ نہیں اترتا اس کے حلق سے۔ کہیں بھی سہی کہ بھئی! اتنے دنوں سے آپ کچھ نہیں کھا رہی، کچھ کھا لو۔ کہے گی، میرا دل ہی نہیں چاہتا۔ تو جب حزن بڑھتا ہے کھانا پینا چھوٹ جاتا ہے۔

جب خوف بڑھتا ہے تو انسان کے گناہ چھوٹ جاتے ہیں۔ ہمارے مشائخ جو گناہ سے بچتے تھے، وہ فرشتے نہیں تھے، وہ انسان تھے مگر انہوں نے اپنے دل میں اللہ کے خوف کو اتنا بڑھا لیا تھا کہ گناہ کی طرف آنکھ اٹھا کر بھی نہیں دیکھتے تھے۔ ان کو گناہ کے مواقع ملتے تھے، یہ نہیں کہ انہیں موقع ہی نہیں ملتا تھا...... گناہ کی دعوت ملتی تھی مگر وہ فوراً کہتے تھے: مَعَاذَ اللّٰہ میں اللہ کی پناہ مانگتا ہوں۔ یہ اس لیے کہ دل میں خوف ہوتا تھا۔

خوف سے گناہ کیسے چھوٹتے ہیں؟

نوجوان کہیں گے کہ جی خوف سے گناہ کیسے چھوٹ سکتے ہیں؟ اس کی مثال حضرت اقدس تھانوی رحمۃ اللہ علیہ نے دی ہے۔ وہ فرماتے ہیں کہ ایک آدمی نے رشوت کے ایک لاکھ روپے لیے، لے کر جا رہا تھا کہ اچانک اسے کسی نے کہا کہ تمہارے پیچھے پولیس لگی ہوئی ہے، اسے پتہ چل گیا ہے کہ تم نے رشوت لی ہے۔ اگر یہ ایک لاکھ روپے تم سے برآمد ہوگئے تو تم نوکری سے بھی جاؤ گے اور جیل میں بھی جاؤ گے۔ اب اس کی کوشش ہوگی کہ یہ لاکھ روپے میں کہیں پھینک دوں۔ اسے چھپانے کی جگہ نہیں ملتی تو ایک گٹر ملتا ہے وہ اسی میں ڈال دیتا ہے۔ اب اس کو پتہ ہے کہ لاکھ روپیہ اس کے اندر ڈال دوں گا تو یہ روپیہ ضائع ہو جائے گا لیکن وہ لاکھ روپیہ گٹر کے اندر ڈال دیتا ہے، اور خوش ہو جاتا ہے۔ آپ بتائیں کہ لاکھ روپیہ ڈال کر وہ غمگین ہوگا یا خوش ہوگا؟ تو جس طرح وہ لاکھ روپیہ چھوڑ دیتا ہے اور چھوڑنے پر خوش ہوتا ہے، اسی طرح مومن کامل بھی گناہوں کو چھوڑتا ہے اور چھوڑنے پر خوش ہوتا ہے، اسے ذہنی سکون ملتا ہے۔

خوف کی کمی کا نتیجہ:

آج خوفِ خدا کی کمی ہے...... دوڑ دوڑ کر گناہ کرتے ہیں، بھاگ بھاگ کر گناہ کرتے ہیں، سوچ سوچ کر گناہ کرتے ہیں، ترکیبیں بنا بنا کر گناہ کرتے ہیں، تمنائیں ہوتی ہیں کہ ہائے! گناہ کا موقع مل جائے...... کیا وجہ؟ خوفِ خدا کی کمی۔

جس عورت کو پتہ ہو کہ میرا خاوند مجھے دیکھ رہا ہے، وہ کسی غیر مرد سے بات کرنے کی جرأت بھی نہیں کرے گی کیونکہ اسے پتہ ہوتا ہے کہ میرا خاوند مجھے طلاق دے دے

گا۔اسی طرح جب دل میں یہ ڈر ہو کہ اللہ تعالیٰ مجھے دیکھ رہے ہیں اور میں اگر گناہ کبیرہ کا مرتکب ہوں گا اللہ رب العزت کہیں اپنے کامل بندوں کی فہرست سے نام ہی نکال دیں، اللہ اپنے پسندیدہ بندوں کی فہرست سے نام ہی نہ خارج کر دیں تو پھر بندہ گناہ نہیں کرے گا۔لیکن اس خوف کی کمی ہوتی ہے۔کیا ایک گناہ کر کے یا چند منٹ کی شہوت کو پورا کر کے ہم اللہ رب العزت کے پسندیدہ بندوں کی فہرست سے نام خارج کرانا چاہتے ہیں؟......ہم کتنی بیوقوفی کرتے ہیں؟ ایک چھوٹے بچے کو کہیں کہ بسکٹ کھانے کو لو لیکن اس کے ساتھ ایک تھپڑ منہ پر ماریں گے، تو بچہ سمجھتا ہے کہ بسکٹ کھانے کا لطف تھوڑا ہے، تھپڑ لگنے کی سزا زیادہ ہے۔تو بچہ بھی ہم سے زیادہ سمجھدار ہے، وہ ایک تھپڑ کے بدلے میں بسکٹ نہیں کھاتا۔ہمیں پتہ بھی ہوتا ہے کہ اس گناہ کا کتنا بڑا عذاب ہے پھر بھاگ رہے ہوتے ہیں گناہ کی طرف۔کیوں؟ بے خوفی ہوتی ہے۔

گناہ جہالت کے ساتھ ہوتا ہے:

اس کی وجہ کیا ہے؟ اس کی وجہ یہ ہے کہ اس وقت علم ساتھ نہیں ہوتا، اس وقت ہم جاہل ہوتے ہیں۔

﴿اِنَّمَا التَّوْبَةُ عَلَى اللّٰهِ لِلَّذِيْنَ يَعْمَلُوْنَ السُّوْٓءَ بِجَهَالَةٍ﴾ (النسا:۱۷)

’’بے شک جس توبہ کو قبول کرنا اللہ کے ذمہ ہے وہ تو ان لوگوں کی توبہ ہے جو جہالت سے کوئی برا فعل کر گزرتے ہیں‘‘

جہالت کا لفظ بتا رہا ہے کہ جو بندہ گناہ کا مرتکب ہوتا ہے علم کے ساتھ مرتکب نہیں ہوتا۔کئی گناہ ایسے ہیں کہ جن کو کرتے ہوئے بندے کا ایمان ساتھ نہیں ہوتا۔جو بندہ

زنا کرتا ہے تو جس وقت وہ زنا کا مرتکب ہو رہا ہوتا ہے، ایمان اس سے الگ ہو جاتا ہے۔ چوری کرنے والا جب چوری کر رہا ہوتا ہے، ایمان نکل کر الگ ہو جاتا ہے۔ شراب پینے والا جب شراب پی رہا ہوتا ہے اس کا ایمان نکل کر الگ ہو جاتا ہے۔ اس کا مطلب ہوا کہ جتنے منٹ ہم نے اس گناہ کے کرنے میں گزارے، ہم نے وہ لمحے اپنی زندگی کے کفر کی حالت میں گزارے۔ ایمان اندر نہیں تھا، ایمان تھا مگر حکماً ایک طرف ہو گیا تھا۔ گناہوں پر اتنی بڑی سزا! ایک عام آدمی کرے جس کو دین کا پتہ ہی نہیں اس کی تو بات اور ہے اور جس کو پتہ ہو وہ تو پھر گناہ نہیں کرے گا۔ اس لیے علمِ نافع انسان کے دل میں اللہ کا خوف پیدا کر دیتا ہے۔

بکرے کی ماں کب تک خیر منائے گی:

اردو میں کہتے ہیں کہ بکرے کی ماں کب تک خیر منائے گی۔ بھئی! اس نے آخر ایک دن تو قصائی کے ہاتھ آنا ہی ہے، چھری تو اس کی گردن پر چلنی ہے۔ ایسے ہی ہم کب تک دوڑتے پھریں گے؟ ہم کب تک اپنی خواہشات کو پورا کرتے پھریں گے؟ آخر فرشتوں نے آ پکڑنا ہے۔ فرق اتنا ہے کہ دنیا کی پولیس ہتھکڑیاں لگا کر مجرم کو پیش کر دیتی ہے اور اللہ تعالیٰ کے ہاں لوگ آتے ہیں بندے کو چارپائی پر لٹا کر قبر میں لے جاتے ہیں، اس کو اس طرح سے گرفتار کیا جاتا ہے۔ اور آگے تو پھر زمین بھی کہتی ہے کہ جتنے بندے زمین پر چلتے تھے مجھے سب سے زیادہ نفرت تجھ سے تھی۔ اب تو میرے اندر آیا ہے تو ذرا دیکھنا میں تیرے ساتھ کرتی کیا ہوں؟ ؎

اب تو گھبرا کے یہ کہتے ہیں کہ مر جائیں گے
مر کے بھی چین نہ پایا تو کدھر جائیں گے

جب عمل بڑھتا ہے تو اضع بڑھتی ہے:

جب علم بڑھتا ہے تو خوف بڑھتا ہے اور انسان نیک عمل کرتا ہے، پھر اس سے بھی آگے۔

كُلَّمَا ازْدَادَ عَمَلًا، اِزْدَادَ تَوَاضُعًا

''جتنا عمل زیادہ ہوتا ہے اتنی تواضع بڑھ جاتی ہے''

جتنا انسان کا عمل بڑھتا جائے، اتنا انسان کی تواضع بڑھتی جائے، اتنا جھکتا جائے۔ یہ نہیں کہ میں تو تہجد کی پابندی کرتا ہوں، تکبیرِ اولیٰ کی پابندی کرتا ہوں، میں اعلیٰ ہوں اور باقی سارے جو ہیں یہ کم درجے پر ہیں۔نہیں جتنا عمل زیادہ ہو اتنی تواضع بڑھے۔

اکابر کی تواضع:

ہمارے اکابر جتنا زیادہ عمل کرتے تھے اتنے ہی متواضع ہوا کرتے تھے۔

⊙......ایک بزرگ تھے، تہجد کے لیے اٹھے تو بیٹا بھی اٹھ گیا۔ جب تہجد پڑھ لی تو بیٹا کہنے لگا: ابو! اور کوئی بھی تہجد کے لیے نہیں اٹھا۔ بزرگ نے فرمایا: بیٹا! تو سویا رہتا تو تیرا سویا رہنا جو بات تو نے کہی اس سے بہتر تھا۔ مطلب کہ تو نے عجب کے ساتھ یہ بات کی کہ میں اٹھ گیا اور یہ سوئے رہے، تو اس سے بہتر تھا کہ تو بھی سویا رہتا۔

⊙......حسن بصری رحمۃ اللہ علیہ کے ایک مرید تھے کشتی میں سفر کر رہے تھے۔ کشتی میں ایک آدمی تھا جو مچھلیاں پکڑتا تھا، کنارے پر وہ مچھلیاں پکڑ رہا تھا۔ سارے دن میں جو اس نے مچھلیاں پکڑی تھیں وہ چھوٹی چھوٹی مچھلیاں تھیں۔ انہوں نے جب اس کو دیکھا تو اس کو کہا کہ لاؤ! میں بھی جال پھینکتا ہوں۔ انہوں نے جو جال پھینکا تو اس میں بہت

بڑی مچھلی آ گئی، تو یہ بڑے خوش ہوئے۔ یہ بات حضرت حسن بصری رحمۃ اللہ علیہ کو پہنچی کہ جو آپ کا فلاں مرید ہے، اس نے جب جال پھینکا تو اتنی بڑی مچھلی پکڑی گئی۔ حسن بصری رحمۃ اللہ علیہ سر جھکا کر بیٹھ گئے۔ اس کو بلایا اور کہا کہ کاش! تو جال پھینکتا اور تیرے جال میں کوئی سانپ آتا اور تجھے ڈس لیتا یہ بہتر تھا اس سے کہ بڑی مچھلی پکڑی اور تو نے اپنی فضیلت لوگوں پر ظاہر کر دی۔ کیونکہ اس سے ذرا عجب پیدا ہوا، میں پیدا ہوئی جو خطرناک ہے۔

تو ہمارے مشائخ میں جتنا علم بڑھتا تھا اتنا خوف بڑھتا تھا اور جتنا عمل بڑھتا تھا اتنی تواضع بڑھتی تھی، جھکتے چلے جاتے تھے۔ اور دستور بھی ہم نے دیکھا ہے کہ جس شاخ پر جتنا زیادہ پھل لگا ہو وہ شاخ اتنی جھکی ہوئی ہوتی ہے۔ اس لیے علم نافع کی یہ پہچان کہ

كُلَّمَا ازْدَادَ عِلْمًا، اِزْدَادَ خَوْفًا وَ كُلَّمَا ازْدَادَ عَمَلًا، اِزْدَادَ تَوَاضُعًا

ابنِ جوزی رحمۃ اللہ علیہ کا فرمان:

ابنِ جوزی رحمۃ اللہ علیہ نے ایک مرتبہ علمِ نافع پر بیان کیا، فرمانے لگے کہ دوستو! ہونا تو یہ چاہیے تھا کہ تم نے جو کچھ سنا اس کی وجہ سے رات بھر نیند نہ آتی۔ تم اللہ کی عظمت کے بارے میں سوچتے اور اپنی نافرمانیوں کے بارے میں سوچتے تو تمہاری نیندیں اڑ جاتیں۔

﴿تَتَجَافٰى جُنُوْبُهُمْ عَنِ الْمَضَاجِعِ﴾ (السجدہ:۱۶)

''بستر سے پہلو جدا رہتے ہیں، خوفِ خدا کی وجہ سے''

گڑگڑا رہے ہوتے ہیں، رو رہے ہوتے ہیں، آہ وزاری کر رہے ہوتے ہیں۔

اللہ! خطا ہوگئی، گناہ ہوگئے، اپنوں کی فہرست سے نام نہ نکال دینا۔ اپنے سے دور نہ کر دینا۔ ع

میرا کوئی نہیں اللہ تیرے سوا

علمِ نافع کا حصول تقوٰی سے ممکن ہے:

اس لیے یہ جو تقوٰی ہے یہ انسان کے علمِ نافع حاصل کرنے کا سبب بن جاتا ہے۔ اس لیے فرمایا:

﴿وَ اتَّقُوا اللّٰهَ وَ يُعَلِّمُكُمُ اللّٰهُ﴾ (البقرۃ:۲۸۲)

''اگر تم تقوٰی کو اختیار کروگے تو اللہ تعالیٰ تمہیں علم عطا کرے گا۔''

یہ علمِ وہبی ہوتا ہے جو سینے کو کھول دیتا ہے، لیکن یہ تب ملتا ہے جب انسان گناہوں سے بچتا ہے۔ بھئی! آپ بتائیں! آپ میں سے کس نے بجلی کی ننگی تار کو ہاتھ لگایا۔ شوق پیدا ہوتا ہے کہ لگاؤں؟ شوق بھی پیدا نہیں ہوتا۔ ننگی تار سامنے ہوتی ہے ہاتھ نہیں بڑھتا، کیوں؟ پتہ ہے کہ ہاتھ لگ گیا تو جان جائے گی۔ اسی طرح اہل اللہ جب چلتے ہیں تو بے پردہ عورتوں کے چہرے سامنے ہوتے ہیں، مگر آنکھ نہیں اٹھتی۔ وہ جانتے ہیں کہ آنکھ اٹھے گی تو ایمان میں خلل آئے گا۔ وہاں جان کا نقصان، یہاں ایمان کا نقصان۔

قرآن میں تقوٰی کی نصیحت:

قرآن مجید میں تقوٰی کا حکم ہر صفحے پر ہے۔ ہر تیسری چوتھی آیت پر اِتَّقُوا اللّٰهَ...... اِتَّقُوا اللّٰهَ...... اور سب سے زیادہ تقوٰی کا حکم سورۃ النساء میں ہے۔ آپ سورۃ پڑھ کر دیکھیں، ہر دو آیتوں کے بعد...... اِتَّقُوا اللّٰهَ...... آتا ہے۔ سورۂ نساء میں کیوں اس کا

حکم زیادہ ہے؟ اس لیے کہ اللہ رب العزت جانتے تھے کہ میاں بیوی کے معاملات اتنے گہرے ہوتے ہیں کہ وہ لوگوں کو پوری بات بتاتے بھی نہیں۔ اگر وہ ایک دوسرے کے حقوق کی رعایت کریں گے تو فقط اللہ تعالیٰ کے خوف کی وجہ سے کریں گے۔ اور اگر دل میں خوفِ خدا نہ ہوا تو بس بات کی بات بنالیں گے، دوسرے کا حق پورا نہیں کریں گے۔ اس لیے بار بار فرمایا: اِتَّقُوا اللّٰهَ...... اللہ سے ڈرو۔

فرمایا:

﴿وَ لَقَدْ وَصَّیْنَا الَّذِیْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ مِنْ قَبْلِكُمْ وَ اِیَّاكُمْ اَنِ اتَّقُوا اللّٰهَ﴾ (النسا:۱۳۱)

''ہم نے تم سے پہلے والوں کو بھی وصیت کی اور آپ کو بھی کر رہے ہیں کہ اللہ سے ڈرو۔''

وصیت کا کیا مطلب؟ وصیت کے رنگ میں نصیحت کرنا۔ یہاں کیا نصیحت ہے؟...... اِتَّقُوا اللّٰهَ...... یہ وہ نصیحت ہے جو پہلے اہلِ ایمان کو بھی کی گئی اور اب بھی کی گئی کہ اللہ سے ڈرو!

تقوای کے دو پہلو:

اس تقوای کے دو پہلو ہیں:

(۱) ایک ہے بندے اور اللہ کے درمیان معاملہ، حرام کھانے اور حرام کام میں احتیاط کرے۔

(۲) اور ایک ہے بندے اور بندے کے درمیان معاملہ۔ اس میں اتنی احتیاط کہ کوئی قیامت کے دن گریبان پکڑنے والا نہ ہو۔

تقویٰ کا ایک پہلو

اپنی ذات کے معاملے میں تقویٰ

ایک تو یہ ہے کہ اپنی ذات کے معاملے میں انسان ہر اس عمل سے جو معصیت کا ارتکاب کروائے، بچے اور احتیاط کرے۔

مشتبہ لقمہ سے پرہیز:

مثلاً کھانے پینے میں جس پر شک پڑ جائے اس کو چھوڑ دے۔ جس پر شبہ ہو اس کو بھی چھوڑ دے۔ ہمارے مشائخ کھانے پینے میں بہت احتیاط کرتے تھے، بڑا خیال رکھتے تھے۔ حتی کہ ہمارے بعض مشائخ بلکہ اکثر حضرات عام طور پر بازار کی بنی ہوئی چیز نہیں کھاتے تھے۔ جب تک تصدیق نہ ہو جاتی کہ بنانے والا نمازی ہے یا طہارت کا خیال رکھنے والا ہے، یا اس کھانے میں جو اشیاء استعمال ہوئی ہیں وہ ساری کی ساری شرعاً ٹھیک ہیں اس وقت تک نہ کھاتے تھے۔

بازار کے کھانے میں احتیاط:

ایک دفعہ مجھے دارالعلوم حقانیہ جانے کا موقع ملا تو حضرت مولانا عبدالحق رحمۃ اللہ علیہ حیات تھے۔ ان کی خدمت میں حاضری ہوئی، وہ ملے اور بہت شفقت فرمائی۔ فرمانے لگے: میں تجھے چپلی کباب کھلاتا ہوں۔ اس زمانے میں چونکہ ابتدائی تصوف کی زندگی تھی اور ہم بازار کی چیزوں سے بہت احتیاط کرتے تھے۔ تو ہمارے اندر تشویش ہوئی کہ اچھا! چپلی کباب؟ وہ تو بازار میں بنتے ہیں۔ حضرت کو تو اللہ نے بصیرت دی ہوئی تھی، وہ پہچان گئے۔ کہنے لگے: بچہ! یہ جو کباب بنانے والا ہے، یہ

نمازی آدمی ہے اور یہ ٹھیک چیز بناتا ہے، اس لیے ہم اس کے کباب کھالیتے ہیں۔ ہم نے تو چپلی کباب کبھی اس لیے نہیں کھائے تھے کہ پتہ نہیں کون بنانے والا اور کیسا بنانے والا ہے؟ پھر اس دن انہوں نے کباب بھی ماشاءاللہ آٹھ دس منگا لیے، ہم نے بھی پھر ٹکا کر کھائے، پچھلے سارے قرضے اتارے۔

تو بتانے کا مقصد یہ تھا کہ ہمارے اکابر اس چیز کا خیال رکھتے تھے کہ اگر بازار سے کوئی چیز آرہی ہے تو پہلے تصدیق کرواتے تھے کہ وہ کیسی ہے؟ یا حالتِ سفر میں مجبوری میں کھالیتے۔ ورنہ عام دستور یہی تھا کہ تحقیق ہوتی تھی۔

پھلوں کی بیع باطل:

حتی کہ بعض بزرگ بازار کے پھل کھانے سے پرہیز کرتے تھے۔ کیونکہ کئی مرتبہ ان کی بیع باطل ہو جاتی ہے۔ فقہ میں ایک بیع فاسد ہوتی ہے اور ایک بیع باطل ہوتی ہے۔ بیع باطل کیا ہے؟ فرض کریں کہ ایک آدمی کا باغ ہے اور اس نے پھل لگنے سے پہلے اس کا سودا کرلیا، شریعت یہ کہتی ہے کہ جب تک تمہارے سامنے سامان موجود نہیں جو تم بیچ رہے ہو، آنکھ سے نہیں دیکھ رہے تو تم سودا نہیں کر سکتے۔ اگر سودا کرو گے یا تو بیچنے والے کا نقصان زیادہ ہوگا کہ پھل بہت زیادہ تھا اور سستا بیچ دیا یا خریدنے والے کا نقصان زیادہ ہوگا کہ پیسے زیادہ بھر بیٹھا اور اس سال پھل لگا ہی نہیں۔ شریعت چونکہ ہمارے لیے ایک نعمت ہے، وہ بیع کرنے والے اور خریدنے والے دونوں کے مفاد کا خیال رکھتی ہے کہ تم کیوں زیادہ نقصان کرتے ہو؟ تم بچو۔ تو کئی علاقوں میں عادت ہوتی ہے کہ وہ پھل آنے سے پہلے باغ کا ٹھیکہ دے دیتے ہیں۔ تو وہ بیع باطل ہوتی ہے، ہمارے مشائخ ایسے باغ کے پھل ہی نہ کھاتے تھے۔

حضرت مولانا احمد علی لاہوری رحمۃ اللہ علیہ کے حالاتِ زندگی پڑھیں، وہ بازار کا پھل نہیں کھاتے تھے۔تقوای تو یہی ہے کہ نہ کھائیں۔مگر فتوای یہ ہے کہ چونکہ سامنے پڑے ہیں اور نہیں پتہ کہ کہاں سے آیا؟ لہٰذا لے کر کھا سکتے ہیں۔فتوای میں اجازت ہے لیکن اہلِ تقوای نہیں کھاتے۔

حلال کنو:

تو ہمیں یاد ہے کہ ہماری زندگی کے بیس سال ایسے تھے کہ ہم بازار سے آم لے کر نہیں کھاتے تھے، آم کی چٹنی بھی نہیں کھاتے تھے، اسی طرح وقت گزرتا تھا۔نہ صحت پر فرق پڑا، نہ ہمارا کوئی نقصان ہوا بلکہ فائدہ ہی ہوا۔ہم کنو بھی نہیں کھاتے تھے۔ہم یونیورسٹی میں پڑھتے تھے تو وہاں مختلف ملکوں سے طلبا آئے ہوئے ہوتے تھے۔ایک عرب نوجوان تھا، وہ جانتا تھا کہ یہ بازار کے پھل نہیں کھاتا۔اللہ کی شان کہ وہ ایک دن کسی آدمی کو ملنے گیا تو اس کے گھر میں کنو کا درخت لگا ہوا تھا۔اس شخص نے درخت سے ایک کنو توڑ کر اسے بھی دے دیا، اس نے وہ کنو رکھ لیا یہ سوچتے ہوئے کہ وہ میرا دوست ہے، وہ بازار کا کنو تو کھاتا نہیں تو میں جا کر اس کو دوں گا۔مجھے آج بھی یاد ہے کہ وہ میرے دروازے پر آیا تو قدرتاً میں اس وقت نماز کے لیے جا رہا تھا کہ تکبیرِ اولیٰ نہ نکل جائے۔اب میں تیزی سے جا رہا ہوں اور وہ پیچھے سے مجھے آوازیں دے رہا ہے، جب مجھے یقین ہو گیا کہ میں مسجد کے اتنا قریب ہو گیا ہوں کہ تکبیرِ اولیٰ مس نہیں ہو گی، تو پھر میں نے پیچھے ہٹ کر دیکھا کہ کون ہے؟ وہ آیا اور کہنے لگا:

I brought a Halal Kino for you

میں تمہارے لیے حلال کنو لے کر آیا ہوں۔

تین ہاتھ تک بیع کا خیال:

عجیب بات تو یہ ہے کہ آج کے دور میں تو ہم ایک ہاتھ میں بھی بیع کا خیال نہیں کرتے۔علامہ عبدالوہاب شعرانی رحمۃ اللہ علیہ ''احوال الصادقین'' کتاب میں لکھتے ہیں کہ ہمارے زمانے میں تین ہاتھ تک بیع کی تحقیق کی جاتی تھی کہ جس سے میں خرید رہا ہوں اس نے کہاں سے لیے؟ کیا ٹھیک لیے؟ پھر اس نے کہاں سے لیے؟ تین ہاتھ تک بیع کا خیال رکھا جاتا تھا۔ہم تو آج ایک ہاتھ تک بھی خیال نہیں رکھتے۔

مشتبہات سے پرہیز:

تو اپنی ذات کی حد تک تقویٰ یہ ہے کہ انسان مشتبہ چیز سے بچے۔

((اَلْحَلَالُ بَیِّنٌ وَ الْحَرَامُ بَیِّنٌ وَ بَیْنَهُمَا مُشْتَبِهَاتٌ)) (صحیح البخاری:۵۰)

''حلال بھی واضح ہے اور حرام بھی واضح ہے اور ان کے درمیان مشتبہ چیزیں ہیں۔''

تو مشتبہ کو بھی اللہ کے لیے چھوڑ دے اور یہ صرف کھانے پینے میں نہیں بلکہ ہر گناہ کے معاملے میں احتیاط کرے۔

حضرت عبدالمالک صدیقی رحمۃ اللہ علیہ کی نظر کی احتیاط:

حضرت خواجہ عبدالمالک صدیقی رحمۃ اللہ علیہ اپنے ایک ہاتھ میں اعصا رکھتے تھے اور دوسرے ہاتھ میں چھتری رکھا کرتے تھے۔سردی میں گرمی میں چھتری ہاتھ میں رہتی تھی۔اب علما بڑے حیران ہوتے کیونکہ جماعت میں اکثر علما ہوتے تھے، امام العلما و الصلحا اسی لیے ان کو کہا گیا۔تو علما بڑے حیران ہوتے تھے کہ گرمی میں تو چھتری رکھنا سمجھ میں آتا ہے کہ دھوپ سے بچاؤ کا ذریعے ہے، سردی میں چھتری رکھتے ہیں، اس

کی کیا وجہ؟ تو ایک صاحب نے ذرا ہمت کر کے پوچھ لیا: حضرت! سردی میں چھتری کیوں رکھتے ہیں؟ پھر حضرت نے بات کھولی۔ فرمانے لگے: آپ چھتری رکھتے ہیں سردی یا گرمی سے بچنے کے لیے، میری نیت کچھ اور ہوتی تھی۔ آپ کی نیت کیا ہوتی ہے؟ جب میں باہر نکلتا ہوں تو جو باہر غیر محرم عورتیں ہوتی ہیں چھتری کی آڑ سے میں اپنی نظر ان پر پڑنے سے بچاتا ہوں۔ اگر دائیں سے کوئی آ رہی ہوتی ہے تو میں چھتری کو دائیں طرف کر لیتا ہوں اور بائیں طرف سے آ رہی ہوتی ہے تو میں چھتری کو اس طرف کر لیتا ہوں۔ میں ان عورتوں کے کپڑے کا رنگ دیکھنا بھی پسند نہیں کرتا۔ یہ تقویٰ ہے۔ ایک ہوتا ہے چہرہ نہ دیکھنا، لیکن کپڑوں کا رنگ بھی نہ دیکھنا، قد کاٹھ کتنا ہے یہ بھی نہ دیکھنا، یہ تقویٰ ہے۔

حضرت فضل علی قریشی رحمۃ اللہ علیہ کی بے نمازی کے کھانے سے احتیاط:

تو ہمارے مشائخ ان باتوں کا بہت خیال رکھتے تھے۔ چنانچہ حضرت خواجہ فضل علی قریشی رحمۃ اللہ علیہ بے نمازی کے ہاتھ کا کھانا نہیں کھاتے تھے۔ فرماتے تھے کہ نمازی آدمی کے ہاتھ سے پکے ہوئے کھانے کا نور میں اپنی آنکھوں سے دیکھتا ہوں۔ اور بے نمازی آدمی کے ہاتھ سے پکے ہوئے کھانے کی ظلمت اپنی آنکھوں سے دیکھتا ہوں۔ تو میں ظلمت والا کھانا کیوں کھاؤں؟

حضرت کے ایک خلیفہ تھے حضرت عبدالمالک چوک قریشی والے۔ انہوں نے ایک واقعہ سنایا۔ کہنے لگے کہ میں حضرت صاحب کے ساتھ سفر میں تھا۔ اور میرے ذمے حضرت کا کھانا بنانا ہوتا تھا، کیونکہ میزبان کا کھانا حضرت نہیں کھاتے تھے۔ حضرت میزبان سے کہتے تھے میں وقت دوں گا، رہوں گا لیکن کھانا اپنا کھاؤں گا۔ کیونکہ بندہ کس کس کی تحقیق کرے کہ اس میں حرام شامل ہے، رشوت شامل ہے یا

کچھ اور شامل ہے۔ آج کل تو بہت سارے لوگ نوکریوں کی تنخواہ پوری لیتے ہیں نوکری کو ٹائم پورا نہیں دیتے، تو حلال کدھر سے ملے۔ حلال کمائی کرتے ہیں بینک میں رکھواتے ہیں اور سود کا پیسہ گھر لے آتے ہیں، تو پتہ نہیں کتنے طریقے ہیں حرام کی ملاوٹ کے۔ اس لیے فرماتے تھے کہ بھئی! میں اپنا کھانے کا انتظام خود کروں گا۔

اور اپنا کھانا کیا تھا؟ ان کے لیے گھی، دال اور کچھ چاول ملا کر کھچڑی بنتی تھی۔ تو وہ خلیفہ صاحب فرماتے ہیں کہ میں حضرت کے لیے کھچڑی بنا لیتا تھا۔ حضرت نے مجھے تاکید کی ہوئی تھی کہ تم نے میرے کھانے کو اس طرح بنانا ہے کہ بے نمازی بندے کا ہاتھ اس کو نہ لگے۔ فرمانے لگے کہ میں نے کھانا بنایا۔ حضرت کے پاس اس وقت ایک مقامی آدمی آ کر بیٹھا کوئی بات کر رہا تھا تو میں کھانا لے کر آ گیا۔ میں نے وہ کھانا جو دیگچی میں تھا، ایک طرف رکھا اور دسترخوان بچھانے لگا۔ دسترخوان جب بچھ گیا تو اب اس پر وہ دیگچی رکھنی تھی۔ وہ آدمی قریب تھا میں نے اسے اشارہ کیا کہ مجھے پکڑا دو تو اس نے دیگچی اٹھا کر مجھے پکڑا دی، میں نے کھانا لگا دیا۔ اب کھانا کھانے لگے تو حضرت نے ہاتھ نہیں بڑھائے، فرمایا: میں نے نہیں کھانا۔ بڑا اصرار کیا، حضرت! آپ نے صبح کا کھایا ہوا ہے، بہت زیادہ وقت ہو گیا۔ حضرت نے فرمایا: میں نے نہیں کھانا۔ حضرت نے انکار کر دیا۔ میری آنکھوں میں آنسو بھی ہیں اور میں نے دیگچی واپس رکھی اور حضرت لیٹ گئے۔ جب وہ بندہ چلا گیا تو میں نے آ کر معافی مانگی اور پوچھا کہ حضرت! کھانا کیوں نہیں کھایا؟ تو حضرت نے فرمایا میں نے تجھے کہا نہیں تھا کہ میرے کھانے کو بے نمازی کے ہاتھ نہ لگنے دینا۔ میں نے کہا کہ اسے کسی بے نمازی کا ہاتھ نہیں لگا۔ فرمایا: میرے سامنے تم نے اشارہ کیا تو اس بندے نے اٹھا کر دیگچی پکڑائی تو بے نمازی کا ہاتھ تو لگ گیا۔ اتنی احتیاط کرتے تھے۔ فرماتے ہیں کہ حضرت بھوکے سو گئے اور آدھی رات کو اچانک اٹھ بیٹھے اور فرمانے لگے: عبدالمالک!

عبدالمالک! میں نے کہا: جی حضرت! فرمانے لگے: میں نے خواب میں دیکھا، کوئی کہنے والا کہہ رہا تھا کہ ''بعض ایسے تقوٰی والے ہوتے ہیں کہ ان کا تقوٰی انبیا کا تقوی ہوا کرتا ہے۔''

چالیس یوم کی برکت:

حضرت مولانا احمد علی لاہوری رحمۃ اللہ علیہ فرمایا کرتے تھے کہ چالیس دن کوئی میرے پاس آ کر رہے اور جو پھل میں بتاؤں وہ کھائے۔ چالیس دن میں اس کے دل سے نور کے چشمے نہ پھوٹیں تو میرا نام بدل دینا۔ چالیس دن اس لیے فرمائے کہ حدیث پاک میں آیا ہے:

((مَنْ اَخْلَصَ لِلّٰهِ اَرْبَعِیْنَ یَوْمًا ظَهَرَتْ یَنَابِیْعُ الْحِكْمَةِ مِنْ قَلْبِهٖ عَلٰی لِسَانِهٖ)) (کنز العمال، رقم: ۵۲۷۱)

''جو چالیس دن اخلاص کے ساتھ اللہ کی عبادت کرے اللہ اس کے دل سے حکمت کے چشمے جاری کر دیتے ہیں۔''

اور بعض نے عجیب استنباط کیا۔ وہ کہتے ہیں جو مرغی آوارہ پھرنے والی اور گندی چیزیں کھانے والی ہوتی ہے، اس کو ذبح کر کے کھانے میں فقہا نے احتیاط لکھی ہے۔ احتیاط یہ ہے کہ پکڑے اور کچھ دن اپنے پاس رکھے۔ فقہا نے دن متعین کیے ہیں، بکری کو اتنے دن رکھو اور مرغی کو اتنے دن اور فلاں کو اتنے دن۔ ہم نے فقہ کی ایک کتاب پڑھی تھی، اس میں زیادہ سے زیادہ چالیس دن لکھے ہوئے تھے۔ تو فقہا نے لکھا کہ جس طرح گندی چیزیں کھانے والے جانور کے جسم کے اندر نجاست کے جو اثرات ہیں، اس کو چالیس دن رکھیں تو اس کے اندر کی ظلمت زائل ہو جاتی ہے، تو جو چالیس دن گناہوں سے بچ کر نیکی پر زندگی گزارے گا، اس کے من کی ظلمت بھی تو

نکل سکتی ہے۔ اِدھر اللہ نے اس جانور کا گوشت حلال کر دیا اُدھر اللہ نے اس بندے کے جسم کو جہنم سے آزاد کر دیا۔

تو جتنا تقویٰ زیادہ ہوگا، اتنا علم گہرا ہوگا۔ اللہ کی طرف سے علم کے دروازے کھل جاتے ہیں۔

﴿وَاتَّقُوا اللّٰهَ وَ يُعَلِّمُكُمُ اللّٰهُ﴾

تم تقویٰ اختیار کرو گے، تمہیں اللہ علم عطا فرمائے گا۔

حضرت عبدالمالک صدیقی رحمۃ اللہ علیہ کی فراست:

ہمارے حضرت، حضرت عبدالمالک صدیقی رحمۃ اللہ علیہ کو بڑے لوگوں نے آزمایا۔ مشتبہ پیسے سے مرغن غذائیں، روسٹ بروسٹ، یہ چیزیں بھی لاکر ان کے سامنے رکھ دیں، اور حلال پیسے کی بے نمک قسم کی کھچڑی بھی پکا کر رکھ دی۔ حضرت فقط دال کھا کر وہاں سے اٹھ گئے، اور کسی چیز کو ہاتھ ہی نہیں لگایا۔ یہ ایک فراست ہوتی ہے۔

((اِتَّقُوْا فِرَاسَةَ الْمُؤْمِنِ فَاِنَّهٗ يَنْظُرُ بِنُوْرِ اللّٰهِ)) (الترمذی، رقم: ۳۰۵۲)

''مومن کی فراست سے ڈرو کیونکہ وہ اللہ کے نور سے دیکھتا ہے''

حضرت کا ایک واقعہ حضرت کے صاحبزادہ عبدالرحمٰن قاسمی رحمۃ اللہ علیہ نے خود مجھے سنایا۔ فرمانے لگے: ایک دفعہ ابا جی (حضرت مرشدِ عالم رحمۃ اللہ علیہ) سفر پر گئے ہوئے تھے اور اسی دوران حضرت خواجہ عبدالمالک صدیقی رحمۃ اللہ علیہ اسلام آباد سے واپسی پر چکوال تشریف لائے، مجھے بہت خوشی ہوئی۔ میں نے حضرت کو بٹھایا، اماں جی کو بتایا کہ حضرت تشریف لائے ہیں، کھانا وغیرہ بنا دیں۔ جب کھانے کا وقت ہوا تو میں نے اس وقت حضرت کے سامنے دسترخوان لگایا اور کھانا سامنے رکھا۔ حضرت نے کھانے کی طرف ہاتھ نہیں بڑھائے۔ میں نے کہا: حضرت! کھا لیجیے! جب میں نے ایک دو

دفعہ کہا کہ حضرت کھائیے! تو حضرت نے میری طرف دیکھ کر فرمایا: قاسمی! تمہارے گھر میں سؤر کیسے داخل ہوا؟ کہنے لگے: جب حضرت نے یہ الفاظ کہے تو میں بہت ہی گھبرا گیا، پسینہ چھوٹ گیا۔تو میں اندر گیا، میں نے کہا: اماجی! حضرت تو کھانا بھی نہیں کھارہے، مجھے فرمارہے ہیں کہ تمہارے گھر میں سؤر کیسے داخل ہوا؟ اس وقت اماں جی نے سر پکڑ لیا۔فرمانے لگیں: اوہو! مجھ سے غلطی ہوئی، یہ جو میری ہمسائی ہے یہ مجھ سے بہت اسرار کیا کرتی تھی کہ جب تمہارے پیر آئیں تو کھانا میں بناؤں گی، تو ہمسائی کا خیال کرتے ہوئے میں نے اس سے ہاں کر دی تھی۔تو اب جب اسے پتہ چلا کہ پیر صاحب آئے ہوئے ہیں تو اس نے مجھے پیغام دے دیا کہ میں کھانا بنا رہی ہوں بھیج دوں گی۔تو بچہ یہ ہمارے گھر کا بنا ہوا کھانا نہیں ہمسائے کے گھر کا بنا ہوا کھانا ہے۔تو اللہ والوں کو اللہ وہ نور دے دیتا ہے کہ وہ دیکھ لیتے ہیں۔

گناہ کے موقع سے بچنا:

کھانا، پینا، اوڑھنا، جو انسان کے ذاتی معاملات ہیں، ان میں احتیاط کرنا کہ کسی گناہ کا ارتکاب نہ ہو۔یوں سمجھیں کہ گناہ کے موقع سے ہی بچنے کی کوشش کرنا، اس کو تقوای کہتے ہیں۔جو بندہ گناہ کے موقع سے ہی بچے اس کو متقی کہتے ہیں۔گناہ کرنا تو دور کی بات اس کے موقع سے ہی بچے۔اللہ تعالیٰ سے دعا بھی مانگنا:

غمِ حیات کے سائے محیط نہ کرنا
کسی غریب کو دل کا غریب نہ کرنا
میں امتحان کے قابل نہیں میرے مولا
مجھے گناہ کا موقع نصیب نہ کرنا

اللہ! مجھے گناہ کے موقع سے ہی بچا، میں نافرمانی نہیں کرنا چاہتا، میرے اللہ! تو میری مدد فرما۔

تقویٰ کا دوسرا پہلو

مخلوق کے ساتھ معاملات میں تقویٰ

تقوی کا دوسرا پہلو یہ ہے کہ اللہ کی مخلوق کے ساتھ انسان کے جو معاملات ہیں، ان کو بھی ایسے اچھے طریقے سے کرے کہ کسی کا دل نہ دکھے، یہ بھی تقوی ہے۔ آج دونوں چیزوں کی کمی ہے کہ گناہوں کے کرنے سے بھی نہیں بچتے اور دوسروں کا حق پامال کرنے سے بھی نہیں بچتے، اس لیے ظلمت بڑھتی جا رہی ہے۔ ہمارے اکابر اس چیز کا کتنا خیال کرتے تھے۔ سبحان اللہ! کچھ مثالیں سن لیجیے!

امام ابوداؤد رحمۃ اللہ علیہ کو چھینک کے جواب کی فکر:

ایک دفعہ امام ابو داؤد رحمۃ اللہ علیہ کشتی پر بیٹھے تھے کہ کنارے پر کھڑے ایک شخص کو چھینک آئی اور اس نے الحمد للہ کہا۔ ان کو پتہ چلا کہ اس نے الحمد للہ کہا تو یہ اس کے قریب جواب نہ دے سکے، دور ہو گئے۔ سوچتے رہے کہ اگر میں جواب دیتا تو وہ بھی جواب دیتے اور مجھے اس کی دعا ملتی، کیا پتہ کہ وہ مستجاب الدعوات شخص ہو تو میں نے تو اس سے دعا لینے کا ایک موقع ضائع کر دیا۔ چنانچہ انہوں نے ایک درہم پر ایک اور کشتی کرائے پر لی اور اس کشتی میں جا کر دوبارہ اس کے سامنے جو جواب دیا جاتا ہے وہ دیا اور اس نے جوابی دعا پڑھ دی۔ رات کو سوئے تو خواب میں دیکھا، کہنے والے نے کہا: ابو داؤد نے ایک درھم کے بدلے میں جنت خرید لی۔ کیوں؟ دل میں اللہ کا ڈر خوف تھا، دل میں خوف ہو تو ایسا بندہ پھر نیکی کا کوئی موقع ضائع نہیں ہونے دیتا۔

ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کو دعاؤں کی طلب:

ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ صحابیِ رسول صلی اللہ علیہ وسلم ہیں۔ چھوٹے بچوں کو کھانے کی چیزیں دیتے

تھے اور کہہ دیتے تھے کہ تم میرے لیے دعا کرنا۔ لوگ کہتے تھے کہ آپ اتنے بوڑھے ہو چکے۔

وَ اَنْتَ صَاحِبُ رَسُوْلِ اللّٰهِ ﷺ

اور آپ رسول ﷺ کے صحابی ہیں۔

فرماتے تھے مجھے اپنے عمل پر اتنا بھروسہ نہیں ہے، ان بچوں کی دعا پر مجھے زیادہ بھروسہ ہے۔ یہ معصوم بچے دعا کریں گے اللہ میرا معاملہ آسان کر دے گا۔ اللہ اکبر کبیرا!! اتنی فکر ہوتی تھی۔

عبداللہ بن مبارک رحمۃ اللہ علیہ کو قلم واپس کرنے کی فکر:

عبداللہ بن مبارک رحمۃ اللہ علیہ کے بارے میں لکھا ہے کہ ایک مرتبہ مرو سے بلادِ شام گئے۔ کچھ لکھنا تھا، کسی سے قلم مانگا، اس نے دے دیا، اب اسے قلم واپس کرنا تھا، وہ بندہ کہیں اِدھر اُدھر ہو گیا تو قلم واپس نہیں کر سکے اور بے دھیانی میں کہیں بات ذہن سے نکل گئی تو واپس آ گئے۔ جب واپس گھر پہنچے تب پتہ چلا تو سوچنے لگے: افوہ! میں تو قلم واپس کیے بغیر واپس آ گیا۔ اب اس قلم کو واپس کرنے کے لیے انہوں نے اپنے گھر سے ملک شام کا دوبارہ سفر کیا کہ کسی کا حق نہ میرے اوپر رہ جائے، قیامت کے دن کوئی میرا گریبان پکڑنے والا نہ ہو۔ (تذکرۃ الاولیاء، ص:۲۲۹)

اب ہم اپنی زندگی میں سوچیں کہ کیا ہماری زندگی ایسی ہے کہ قیامت کے دن کوئی ہمارا گریبان پکڑنے والا نہیں ہوگا۔ پتہ نہیں کتنوں کے دل دکھائے؟ کتنوں کی غیبت کی؟ کتنوں پر بہتان لگائے؟ کون کون آئے گا گریبان پکڑنے والا؟ اس پر فکر مند ہونے کی ضرورت ہے۔

حضرت مرشدِ عالم رحمۃ اللہ علیہ کو اہلیہ کی دل آزاری کا احساس:

چنانچہ حضرت مرشدِ عالم رحمۃ اللہ علیہ نے ایک واقعہ خود بیان میں سنایا۔فرمانے لگے کہ میں گھر میں وضو کر رہا تھا اور اہلیہ صاحبہ وضو کروا رہی تھیں (یہ وفات سے چند سال پہلے کا واقعہ ہے) تو وضو کروانے کے دوران کسی عضو پر پانی ڈالنے میں کچھ کمی ہوئی۔جیسے بازو پر پانی ڈالتے ہوئے کچھ کوتاہی ہو جاتی ہے، یا پاؤں پر پانی ڈالتے ہوئے انگلیوں کی طرف سے پانی ڈالنیمیں کوتاہی ہوسکتی ہے۔کچھ اس قسم کی بات ہوئی۔ حضرت فرماتے ہیں کہ میں نے اسے ذرا غصہ میں کہہ دیا کہ دیکھتی نہیں ہو؟ تو وہ چپ ہوگئیں پانی ڈالتی رہیں۔جب میں وضو کرنے کے بعد مسجد کی طرف چلا کہ جا کر نماز پڑھاؤں۔(ہمارے حضرت رحمۃ اللہ علیہ اپنی زندگی میں اپنی مسجد میں امامت خود کرواتے تھے)۔تو حضرت فرماتے ہیں کہ جب میں مسجد کے دروازے پر پہنچا تو مجھے یہ خیال آیا کہ میں مسجد میں جا کر امامت کرواؤں گا اور گھر میں معمولی سی بات پر میں گھر والی کو ڈانٹ کر آیا ہوں اور اس کا دل دکھایا، میری نماز کہاں قبول ہوگی؟ تو فرماتے ہیں کہ میں نے چھوٹے بچے کو بلایا اور بلا کر کہا کہ نمازیوں کو کہیں کہ میرا انتظار کریں میں تھوڑی دیر میں آتا ہوں اور خود نماز پڑھاؤں گا۔اور وہاں سے لوٹ کر میں واپس گھر آیا۔بیوی حیران ہوئی کہ آپ اتنی جلدی واپس کیسے آگئے؟ تو میں نے اس سے معافی مانگی کہ میں نے جلد بازی میں آپ کو ڈانٹ دیا، آپ کا دل دکھایا، مہربانی کر کے مجھے معاف کردو، وہ مسکرا پڑی، کہنے لگی کوئی بات نہیں۔فرماتے ہیں کہ جب وہ مسکرائی تو تب مجھے سکون ہوا کہ اس نے مجھے معاف کر دیا، پھر میں آیا اور آ کر امامت کے مصلے پر کھڑا ہوا کہ اب میری نماز کو میرے اللہ ضرور قبول فرمائیں گے۔دوسرے کے دل کی

اتنی احتیاط کرتے تھے۔

خشیت ایک نعمت ہے:

توعلم نافع سے انسان کا خوف بڑھتا ہے۔

اس لیے تو ہم دعا مانگتے ہیں:

((اَللّٰهُمَّ اقْسِمْ لَنَا مِنْ خَشْيَتِكَ مَا يَحُوْلُ بَيْنَنَا وَ بَيْنَ مَعَاصِيْكَ))

(الترمذی، رقم:۴۳۲۴)

''اے اللہ! میں آپ سے وہ خشیت چاہتا ہوں جو میرے اور میرے گناہوں کے درمیان میں حائل ہو جائے''

گناہوں سے میری جان چھڑا دے، یہ بھی اللہ کی نعمت ہے، اللہ جس کو عطا فرما دے۔

تقویٰ اور صبر سے عزت ملتی ہے:

تقویٰ اور صبر یہ دو چیزیں انسان کو دنیا وآخرت میں عزتیں دلا دیتی ہیں۔ اس کا ثبوت قرآن پاک سے دیکھیں! حضرت یوسف علیہ السلام کو دیکھیں! عمر چھوٹی ہے، بھائیوں نے کنویں میں ڈال دیا اور جب کنویں سے نکالا گیا تو نکالنے والوں نے جا کر بازار میں بیچ دیا۔ ایک غلام کی حیثیت سے بکے۔ مگر انہوں نے تقویٰ اور صبر، ان دو چیزوں کے ساتھ زندگی گزاری۔ نتیجہ کیا ہوا کہ جس علاقے میں کوئی واقف نہیں تھا، کوئی برادری نہیں تھی، کوئی دوست نہیں تھے، اس علاقے میں اللہ رب العزت نے معاملہ ایسا کیا کہ ان کو تخت کے اوپر بٹھا دیا۔ کیا یہ حیرت کی بات نہیں کہ سب غیر تھے، جہاں کوئی جانتا پہچانتا نہیں تھا، اس علاقے میں اللہ تعالیٰ نے ان کو بادشاہ بنا دیا اور

خزانے کی کنجیاں اللہ نے ان کے ہاتھوں میں پکڑا دیں۔ اس لیے جب بھائی آئے تو انہوں نے آکر کہا:

﴿یٰۤاَیُّهَا الْعَزِیْزُ مَسَّنَا وَ اَهْلَنَا الضُّرُّ﴾

اے عزیزِ مصر! ہمیں اور ہمارے اہلِ خانہ کو تنگ دستی نے بے حال کر دیا۔

﴿وَ جِئْنَا بِبِضَاعَةٍ مُّزْجٰىةٍ فَاَوْفِ لَنَا الْكَیْلَ﴾

''اور ہم قیمت بھی جو لائے ہیں پوری نہیں ہے، ہمیں غلہ پورا دیجیے''

﴿وَ تَصَدَّقْ عَلَیْنَا﴾

''آپ ہمارے اوپر صدقہ خیرات کر دیجیے۔''

﴿اِنَّ اللّٰهَ یَجْزِی الْمُتَصَدِّقِیْنَ﴾

''اللہ صدقہ دینے والوں کو جزا دیتا ہے۔''

جب انہوں نے صدقہ مانگا۔ صدقہ کا کیا مطلب ہے؟ اللہ کے نام پر مانگا۔ اللہ کے واسطے، جیسے فقیر مانگتا ہے۔ تو یوسف علیہ السلام نے سوچا: اچھا! ''معاملہ بایں جا رسید'' یہاں تک نوبت پہنچی ہے، تھے تو وہ بھائی بھی نبی زادے، نبی علیہ السلام کے بیٹے تھے۔ اور بات فقیری تک پہنچی۔ اس وقت انہوں نے بھائیوں سے پوچھا:

﴿مَا فَعَلْتُمْ بِیُوْسُفَ؟﴾

تم نے یوسف کے ساتھ کیا سلوک کیا تھا؟

ان کی تو آنکھیں ہی کھلی رہ گئیں۔

﴿قَالُوْۤا ءَاِنَّكَ لَاَنْتَ یُوْسُفُ﴾

کہنے لگے: کیا آپ یوسف ہیں؟

﴿قَالَ اَنَا یُوْسُفُ وَ هٰذَا اَخِیْ﴾

ہاں میں یوسف ہوں اور یہ میرا بھائی ہے۔

﴿قَدْ مَنَّ اللّٰهُ عَلَیْنَا﴾

تحقیق اللہ نے ہم پر احسان کیا۔

﴿اِنَّهٗ مَنْ یَّتَّقِ وَ یَصْبِرْ فَاِنَّ اللّٰهَ لَا یُضِیْعُ اَجْرَ الْمُحْسِنِیْنَ﴾

(یوسف:۹۰)

''جوتقوی اختیار کرتا ہے اور صبر وضبط کے ساتھ زندگی گزارتا ہے۔اللہ ایسے نیکوکاروں کے اجر کو ضائع نہیں کیا کرتے''

قیامت تک کے لیے اصول بن گیا کہ ہر دور اور ہر زمانہ میں جو بھی شخص سیدنا یوسف علیہ السلام کی طرح گناہ سے بچے گا،تقوٰی اور صبر سے زندگی گزارے گا، اللہ اسے فرش سے اٹھائیں گے عرش کے اوپر بٹھا دیں گے۔اور جو یوسف علیہ السلام کے بھائیوں کی طرح گناہ کر لے گا اور کہے گا:

﴿وَتَکُوْنُوْا مِنْۢ بَعْدِهٖ قَوْمًا صٰلِحِیْنَ﴾ (یوسف:۹)

''بعد میں نیک بن جائیں گے''

آج کل شیطان اسی طرح گناہ کرواتا ہے کہ ہاں اب گناہ کر لو بعد میں توبہ کر لینا۔ یہ یوسف علیہ السلام کے بھائیوں کا راستہ ہے۔فرمایا جو اس راستے پر چلے گا اگر چہ وہ نبی علیہ السلام کا ہی بیٹا ہوگا، اللہ اسے بھی فقیر بنا دے گا۔ ہاتھ اٹھائے ہوئے ہوں گے، خدا کے واسطے دے دو۔ جب کہ دوسرا راستہ تقوی اور صبر کا راستہ ہے جو اپنے آپ کو گناہوں سے بچالے گا تو دستور بن گیا کہ تقوٰی اور صبر والوں کو اللہ رب العزت ہمیشہ عزتوں سے نوازتا ہے۔

علم نافع اور توکل

بعض بزرگوں نے علمِ نافع کی ایک اور بھی پہچان بتائی، وہ فرماتے ہیں کہ

تَقْدِيْمُ الْعِلْمِ عَلٰى حُظُوْظِ النَّفْسِ وَ الْاِسْتِغْنَاءُ بِاللّٰهِ عَنْ جَمِيْعِ خَلْقِهٖ

''علم کو لذاتِ نفسانی پر مقدم کرے اور اللہ کے تعلق کے ساتھ ساری مخلوق سے مستغنی ہو جائے''

تو پہلے

تَقْدِيْمُ الْعِلْمِ عَلٰى حُظُوْظِ النَّفْسِ

علم حاصل کرنے کے لیے آئے ہیں تو علم حاصل کرنا مقدم رہے۔ ورنہ تو دوستیوں میں لگ جاتے ہیں۔کبھی کسی شکل نے دل پر غلبہ کیا کبھی کسی شکل نے دل پر غلبہ کیا۔ ؎

اس دل کے ٹکڑے ہزار ہوئے
کوئی یہاں گرا کوئی وہاں گرا

جدھر نظر پڑتی ہے اسی کا غلبہ دل پر ہو جاتا ہے۔ یہ دل کیا ہوا ٹریش کین بنا لیا...... جو چیز استعمال کی، ٹریش کین میں پھینک دی۔ دل کو بھی ایسا ہی بنا لیا۔ یہ بھی دل میں تو وہ بھی دل میں، جدھر نظر اٹھی وہی دل میں۔ انسان ایسا بھی نہ ہو کہ پیشاب سے ہی پھسلتا پھرے۔ آگے فرمایا:

وَ الْاِسْتِغْنَاءُ بِاللّٰهِ عَنْ جَمِيْعِ خَلْقِهٖ

ساری مخلوق سے انسان مستغنی ہو جائے، اور اپنی ساری امیدیں اللہ سے لگا

لے۔اس کو کہتے ہیں توکل۔مخلوق سے نظریں ہٹا لینا اور خالق پر نظریں جما لینا۔تو دو بڑے اہم کام ہیں۔تقویٰ اور توکل۔

رابعہ بصریہ رحمۃ اللہ علیہا کا مقامِ توکل:

ہمارے اکابر کی زندگی میں بہت توکل تھا۔ ہر معاملے میں اللہ کی طرف دھیان ہوتا تھا۔ اتنا یقین تھا اللہ کے وعدوں پر کہ ان کے واقعات سن کر حیرت ہوتی ہے۔ رابعہ بصریہ اللہ کی نیک بندی تھیں۔ ایک دفعہ ان کے مہمان آ گئے اور وقت ہو گیا کھانے کا۔گھر میں جو خادمہ تھی وہ بڑی پریشان تھی کہ پکانے کو کچھ ہے نہیں اور مہمان بیٹھے ہیں، ان کو کیا پیش کریں؟ اتنے میں دروازہ کھٹکا۔ خادمہ گئی اور آ کر بتایا کہ کوئی کھانے کے لیے روٹیاں دے کر گیا ہے۔ رابعہ بصریہ رحمۃ اللہ علیہا نے پوچھا کہ کتنی روٹیاں ہیں؟ خادمہ نے جواب دیا کہ اٹھارہ ہیں۔فرمانے لگیں: کھانا واپس کر دو یہ ہمارا کھانا نہیں ہے۔ خادمہ کہنے لگی کہ جی کھانے کا وقت ہو گیا، مہمان بیٹھے ہوئے ہیں، اب یہ کوئی اللہ کا بندہ کھانا لے کر آیا ہے تو قبول کر لیں، کیوں روٹیوں کی تعداد پر اڑ گئی ہیں؟ کہنے لگیں: دیکھو! صبح میرے پاس ایک روٹی تھی، میں بھوکی تھی، سائل آیا، اللہ کے نام پر اس نے مانگا، میں نے وہ روٹی اس کو دے دی، اب مجھے پکا یقین ہے کہ

((مَنْ جَاءَ بِالْحَسَنَةِ فَلَهُ عَشْرُ اَمْثَالِهَا)) (الانعام:۱۶۰)

اللہ کم از کم ایک کے بدلے دس واپس کرتا ہے تو اٹھارہ روٹیاں میری نہیں ہیں، مجھے بیس روٹیاں چاہئیں۔خادمہ نے ہاتھ جوڑ دیئے، کہنے لگی: دراصل وہ بیس ہی لایا تھا، کیونکہ مجھے شدید بھوک لگی ہوئی تھی تو دو روٹیاں میں نے الگ کر لی تھی۔ اتنا یقین تھا اللہ کے بارے میں! (تذکرۃ الاولیاء: ص ۱۰۰)

حضرت اقدس نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ کا مقامِ توکل:

حضرت اقدس نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ ان کو بھی اللہ تعالیٰ نے یہی مقام توکل عطا فرمایا تھا۔ انہوں نے جب دارالعلوم دیوبند بنایا تو اس کے قواعد وضوابط میں یہ شرط رکھوائی کہ دارالعلوم کے لیے مستقل آمدنی کا کوئی ذریعہ قبول نہیں کیا جائے گا۔ کتنا فرق ہے ہم میں اور ان میں؟ ہم نفلیں پڑھ کر دعائیں مانگ رہے ہوتے ہیں کہ اللہ! کوئی مستقل ذریعہ بنا دے۔ اور وہ فرماتے ہیں کہ کوئی مستقل سبب قبول ہی نہیں کرنا۔ کسی نے پوچھا: حضرت! کیوں؟ فرمانے لگے: اس لیے کہ پھر اللہ کے بجائے نظر اس سبب کی طرف لگ جائے گی اور اللہ کے دفتر سے میرا نام نکال دیا جائے گا۔

حضرت خواجہ عبدالمالک صدیقی رحمۃ اللہ علیہ کا مقامِ توکل:

ہمارے حضرت، حضرت خواجہ عبدالمالک صدیقی رحمۃ اللہ علیہ کو اللہ نے عجیب مقامِ توکل عطا کیا تھا۔ انہوں نے خانیوال میں ایک مسجد بنوائی جو شہر کی سب سے بڑی مسجد ہے۔ اب تو اس کو ''مینار مسجد'' کہتے ہیں۔ کیونکہ اس کا مینار ہی اتنا بڑا ہے، لیکن ابتدا میں اس کا کوئی نام نہیں تھا۔ تو لوگوں نے اس کا نام رکھ دیا تھا: ''بے چندہ مسجد''۔ جو باہر سے پوچھنے آتا تھا کہ مجھے خواجہ صاحب کی مسجد میں جانا ہے تو تانگے والوں نے اس کا نام ''بے چندہ مسجد'' نام رکھ دیا تھا۔ کیونکہ اس کا کبھی چندہ ہی نہیں کیا گیا تھا۔

ہم نے اپنی والدہ صاحبہ (جو حضرت رحمۃ اللہ علیہ کی اہلیہ تھیں) سے خود یہ بات سنی، وہ فرماتی تھیں کہ کئی مرتبہ میں دیکھتی تھی کہ حضرت کی جیب میں پیسے کم ہوتے تو وہ جلدی سے ان کو بھی خرچ کر دیتے۔ میں عورت ذات تھی، میں ان سے کہتی کہ آپ تھوڑا احتیاط سے خرچ کیا کریں کہ جیب میں کچھ رہے، کوئی ضرورت پڑ جاتی ہے۔ تو

حضرت مسکرا کر فرماتے تھے کہ جیب خالی ہو گی تو اللہ اسے دوبارہ بھریں گے۔اور واقعی جیب خالی ہوتی تھی، اللہ اسے فوراً بھر دیتے تھے۔جو اللہ پر توکل کرتے ہیں، اللہ ان کی جیب کو خالی نہیں رہنے دیتے۔اللہ والوں کے ہاتھ اللہ تعالیٰ کی جیب میں ہوتے ہیں۔ ؎

میں لج پالاں دے لڑ لگیاں میرے توں غم پرے رہندے
میری آساں امیداں دے سدا بوٹے ہرے رہندے
کدے وی لوڑ نہیں پیندی مینوں در در تے جاون دی
میں منگتی اللہ سائیں دی میرے پلے بھرے رہندے

جو اللہ پر نظریں لگا دیتا ہے اللہ اس کے پلے بھر دیتا ہے۔در در کے دھکے کھانے سے بچا لیتا ہے۔اس لیے فرمایا:

﴿وَمَنْ يَّتَوَكَّلْ عَلَى اللّٰهِ فَهُوَ حَسْبُهٗ﴾

''جو اللہ پر توکل کرتا ہے، اللہ اس کے لیے کافی ہو جاتا ہے۔''

اور ایک جگہ پر فرمایا:

﴿وَتَوَكَّلْ عَلَى اللّٰهِ وَكَفٰى بِاللّٰهِ وَكِيْلًا﴾

''اللہ پر توکل کرو اللہ ہی وکیل کافی ہے''

اللہ کو وکیل بنا لو! کونسا کام پھر اٹک سکتا ہے۔

توکل پر رزق ملنے کا عجیب واقعہ:

ایک دفعہ مسکین پور شریف کی مسجد میں حاضر تھے۔تو حضرت فضل علی قریشی رحمۃ اللہ علیہ کے خلیفہ حضرت خواجہ عبدالمالک رحمۃ اللہ علیہ چوک قریشی والے نے نماز پڑھائی۔نماز کے

بعد میں کچھ دیر ان کے پاس بیٹھ گیا تو مجھے فرمانے لگے کہ میں تمہیں ایک واقعہ مسجد میں باوضو بیٹھ کر سناتا ہوں۔ پھر اپنی خلافت ملنے کا پورا واقعہ سنایا اور کہا کہ پھر حضرت نے تو خلافت دے دی، میں نے دل میں سوچا کہ میرے اندر اتنی اہلیت نہیں، میں اب آٹھ دس سال محنت کروں گا پھر اگر کسی قابل بنا تو لوگوں کو اللہ اللہ سکھاؤں گا۔ میری اندر سے یہ نیت تھی۔ ایک رات حضرت خواجہ صاحب کے ساتھ بیٹھے آگ سینک رہے تھے اور کچھ باتیں کر رہے تھے کہ حضرت خواجہ صاحب نے مجھے غور سے دیکھا، میں گھبرا گیا۔ پوچھا: جی حضرت! فرمانے لگے: ابھی ابھی مجھے نبی علیہ السلام کی زیارت نصیب ہوئی ہے، کشف میں، جاگتے ہوئے نبی علیہ السلام کی زیارت نصیب ہوئی ہے۔ اور انہوں نے فرمایا ہے کہ عبدالمالک کو کہو کہ اس امانت کو تقسیم کرے ورنہ ہم اس امانت کو واپس لے لیں گے۔ جب یہ کہا تو حضرت نے فرمایا کہ تم نے یہاں بہت میری خدمت کر لی، بس اب اپنے علاقے میں جاؤ اور لوگوں کو اللہ اللہ سکھاؤ، میں کہتا رہا: حضرت! میں اس قابل نہیں، مجھے موقع دیں، فرمایا نہیں۔ حضرت نے اگلے دن میرا اسامان بندھوایا اور میرے سر پر رکھا اور میری چھٹی کہ جاؤ اپنے گھر۔

جب اپنے گھر جانے لگا تو مجھے خیال آیا کہ بھئی میرے گھر میں تو کچھ ہے ہی نہیں۔ نہ میں کام کرنا جانتا ہوں نہ مزدوری کرنا جانتا ہوں تو میں تو وہاں بہت ہی تنگی میں ہوں گا، تو میں نے کہا کہ حضرت! میرے لیے رزق کی دعا کر دیجیے گا۔ حضرت نے ایک ہی بات فرمائی:

﴿إِنَّ اللّٰهَ مَعَ الصّٰبِرِيْنَ﴾

میں جب گھر آیا تو گھر والے بڑے خوش ہوئے کہ ہمارا بچے نے شیخ کی خدمت کی، اجازت وخلافت ملی واپس آ گیا۔ میں سارا دن ذکر ہی کرتا رہتا تھا۔ گھر والوں

نے شادی بھی کر دی۔ اللہ نے بیوی اتنی صابرہ دی کہ وہ بھوکی رہتی اور مجھے صرف یہی کہتی کہ کہیں سے درخت کے پتے ہی لائیں جو میں بھی کھالوں اور آپ بھی کھالیں۔ میں پتے لاتا اور میاں بیوی دونوں بیٹھ کر درخت کے پتے کھاتے، اس طرح پیٹ کو بھرتے تھے۔ ابتدا میں ہمارا یہ حال تھا۔

پھر آگے لمبا واقعہ سنایا۔ حضرت نے پھر ایک چھوٹی سی بوری گندم کی بھیجی اور ساتھ اپنا رقعہ بھیج دیا اور رقعہ میں لکھا کہ عبدالمالک! اس گندم کو بند جگہ پر ڈال دو اور یہ رقعہ بھی اندر ڈال دو اور اوپر سے اس کا ڈھکنا بند کر کے سوراخ بنالو اور سوراخ سے گندم نکال کر استعمال کرتے رہو۔ فرمانے لگے کہ میں نے اسی طرح کیا، گندم بند جگہ میں رکھ دی، رقعہ بھی ڈال دیا، رقعے میں لکھا ہوا تھا ﴿إِنَّ اللّٰهَ مَعَ الصّٰبِرِيْنَ﴾ اور میں اس جگہ سے گندم لے کر کھاتا رہا۔ فرمانے لگے کہ میں باوضو مسجد میں بیٹھ کر بتا رہا ہوں کہ میرے ہاں دو سو سے تین سو مہمان روز ہوتے ہیں اور اجتماع پر ہزاروں مہمان ہوتے ہیں، چالیس سال گزر گئے ہیں، میں اس وقت بھی اپنے گھر میں وہی گندم کھا رہا ہوں۔

جو اللہ پر توکل کرتا ہے، اسے ایسے رزق ملتا ہے۔ اگر ایسے گندم ملے تو کون نوکری کرے گا، پھر کیوں بھاگے گا نوکریوں کے پیچھے؟ ایسے ہی ہوتا ہے جو اللہ کے در پر آجاتا ہے پھر اللہ اسے غیر سے مستغنی کر دیتے ہیں۔ بڑے کی نوکری کر کے ایسا مزا آجاتا ہے کہ پھر اسے دنیا کی طرف آنکھ اٹھا کر دیکھنے کو دل ہی نہیں کرتا، تو دو چیزیں تقوی اور توکل کو اختیار کرنے کی ضرورت ہے۔

تقوای اور توکل کی کمی:

تو علم نافع کی دو نشانیاں سامنے آئیں کہ جس کو علمِ نافع نصیب ہوگا، اس کی

زندگی میں تقوٰی بھی ہوگا اور اس کی زندگی میں توکل بھی ہوگا۔ بہت عجیب بات ہے کہ آج ہمارے مدارس والوں کی زندگی سے تقوی نکل گیا اور خانقاہوں کی زندگی سے توکل نکل گیا۔ حالانکہ یہ تقوی کے اہل زیادہ تھے، وہ توکل کے اہل زیادہ تھے۔

ہمارے ایک بزرگ فرمایا کرتے تھے کہ اتنی مخلوق سے امیدیں لگ گئیں کہ آنے والا مرید اگر سر کھجانے لگے تو پیر صاحب کو توقع ہو جاتی ہے کہ شاید یہ ادھر سے کچھ نکال کر مجھے ہدیہ دے گا۔ تو مدارس والوں کی زندگی سے تقوی نکلتا جارہا ہے اور خانقاہوں کی زندگی سے توکل نکلتا جارہا ہے۔

اخلاق اور اخلاص:

ایک اور نکتے کی بات: جب انسان کی زندگی میں تقوی ہوتا ہے تو اس کی برکت سے بندے کو اخلاص نصیب ہو جاتا ہے۔ چونکہ تقوی اور اخلاص یہ آپس میں لازم و ملزوم ہیں، ان دونوں میں چولی دامن کا ساتھ ہے۔ یہ ہو نہیں سکتا کہ وہ متقی ہو اور مخلص نہ ہو اور یہ ہو نہیں سکتا کہ مخلص ہو اور متقی نہ ہو۔ یہ دونوں جڑواں چیزیں ہیں۔ تو تقوٰی کے ساتھ انسان کے اخلاق کا تعلق ہے اور توکل کے ساتھ انسان کے اخلاص کا تعلق ہے۔ اب یہ بات ذہن میں رکھیے! کہ اخلاق لوگوں کے ساتھ ہوتے ہیں اور اخلاص اللہ جل شانہ کے ساتھ ہوتا ہے۔ تو اس کا مطلب یہ کہ جس کو تقوٰی اور توکل نصیب ہو گیا تو اس کا رشتہ اللہ کے ساتھ بھی ٹھیک ہو گیا، اور اس کا تعلق بندوں کے ساتھ بھی ٹھیک ہو گیا۔ یہ مومن کامل ہے جو انسان کو بننا چاہیے اور جسے اللہ تعالیٰ بھی پسند فرماتے ہیں کہ انسان کے اندر اخلاق بھی ہوں اور اخلاص بھی ہو۔ تو اخلاق آئیں گے تقوٰی سے، اخلاص آئے گا توکل سے۔

تقوای نزولِ برکات کا ذریعہ:

تو ہمیں چاہیے کہ ہم اپنے گناہوں سے توبہ کر کے اپنے اللہ کی طرف متوجہ ہوں تا کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے برکتوں کے دروازے کھل جائیں۔اس لیے ارشاد فرمایا کہ ایمان والو! اگر تم تقوای کو اختیار کرو گے۔

﴿لَفَتَحْنَا عَلَيْهِمْ بَرَكٰتٍ مِّنَ السَّمَآءِ وَ الْاَرْضِ﴾ (الاعراف:۹۶)

''ہم آسمان اور زمین سے برکتوں کے دروازے کھول دیں گے''

اللہ نے برکتوں کے دروازوں کو بند کیا ہوا ہے۔ پھر روتے پھرتے ہیں: ہمارے کام اٹک جاتے ہیں، ہماری ڈیل پوری نہیں ہوتی ، ہوتے ہوتے سودا رہ جاتا ہے، کاروبار نہیں چلتا، سارا دن دوکان پر بیٹھ کر خالی ہاتھ آجاتے ہیں، اولاد کے اندر فرمانبرداری نہیں۔ یہ شکوے سارے کیوں ہوتے ہیں؟ اس لیے کہ برکت کے دروازے کو تو ہم نے گناہ کر کے بند کر دیا، اب دروازہ کیسے کھلے؟ ہم نے اپنے ہاتھوں سے برکتوں کے دروازے کو بند کر دیا، فرمایا:

﴿وَ مَا ظَلَمَهُمُ اللّٰهُ وَ لٰكِنْ اَنْفُسَهُمْ يَظْلِمُوْنَ﴾ (آل عمران:۱۷)

''اللہ نے ان پر ظلم نہیں کیا، بلکہ انہوں نے اپنی جانوں پر خود ظلم کیا''

ہم اگر چاہتے ہیں کہ ہمیں برکتوں والی زندگی ملے تو ہم اپنے گناہوں سے سچی توبہ کریں۔

گناہ......بے سکونی کا ذریعہ:

اس لیے حضرت مفتی محمد شفیع رحمۃ اللہ علیہ نے بہت خوبصورت بات کہی کہ اے دوست! تو جتنا چاہے گناہ کر لے اگر اللہ نے تیری اسی زندگی کو جہنم کی طرح نہ بنا دیا تو میرا نام

بدل دینا۔ تو جو بندہ گناہ کرتا ہے تو اس کے لیے یہی زندگی جہنم بن جاتی ہے۔ اتنی پریشانیاں آتی ہیں کہ دن کو چین نہیں آتا رات کو نیند نہیں آتی۔ آپ کا کیا خیال ہے؟ یہ جو دنیا والے، مال والے، عہدوں والے، امارتوں وزارتوں والے، فیکٹریوں والے، بڑے بڑے کاروباروں والے ہیں، یہ پرسکون زندگی گزارتے پھرتے ہیں۔ اس عاجز کو اللہ نے پچاس سے زیادہ ملکوں میں سفر کی توفیق دی، میں نے آج تک اپنی زندگی میں کسی دنیادار بندے کو پرسکون زندگی گزارتے نہیں دیکھا۔ جہاں پرسکون نظر آیا کوئی نیک بندہ، متقی پرہیزگار بندہ ہی پرسکون نظر آیا۔ عام آدمی تو ایک ہی دفعہ زندگی میں مرتا ہے، یہ بیچارے پتہ نہیں کتنی دفعہ مرتے ہیں، کتنی دفعہ جیتے ہیں؟ اِدھر کا صدمہ اُدھر کا صدمہ، اِدھر کی ٹینشن اُدھر کی ٹینشن۔ ظاہر میں ان کے ہاں ماشاء اللہ بنگلے بھی ہوں گے، کاریں بھی ہوں گی، نوکر خادم بھی ہوں گے مگر اندر کا حال یہ ہوگا کہ نیند ہی غائب ہوگی۔ گولیاں کھا کھا کر تو یہ لوگ سوتے ہیں اور پوچھتے ہیں کہ پہلے تو ایک گولی کھانے سے نیند آ جاتی تھی اب دو کھانے سے بھی نیند نہیں آتی۔ ہم کہتے ہیں تین کھاؤ۔ کہتے ہیں کیسے تین کھائیں؟، ہم کہتے ہیں کہ اگر گولیوں سے جان چھڑانی ہے تو اللہ سے صلح کرلو، پھر دیکھو! اللہ کیسے تمہارے ساتھ رحمت کا معاملہ کرتے ہیں۔

اللہ سے بگاڑنے سے کام بگڑ جاتے ہیں:

جو اللہ سے بگاڑے گا، اللہ اس کے کاموں کو سنورنے نہیں دے گا، اسکے کام بھی بگڑے رہیں گے۔ بزرگوں نے لکھا کہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں: بندے! ایک تیری چاہت ہے ایک میری چاہت ہے، اگر تو چاہے کہ وہ پورا ہو جو تیری چاہت ہے، تو میں تجھے تھکا بھی دوں گا تیرے کاموں کو بھی پورا نہیں ہونے دونگا۔ آج ہماری زندگیاں بالکل اس کی عملی تصویر بنی ہوئی ہیں۔ اللہ تعالیٰ تھکا بھی رہے ہیں اور کام بھی

پورے نہیں ہو رہے۔کوئی فیکٹری میں تھکتا ہے،کوئی کاروبار میں تھکتا ہے،کوئی بازار میں تھکتا ہے، کام پھر سیدھے نہیں ہوتے۔تو فرمایا: اے میرے بندے! اگر تو چاہے کہ وہ پورا ہو جو تیری مرضی ہے، میں تجھے تھکا بھی دوں گا اور تیرے کاموں کو بھی پورا نہیں ہونے دونگا۔اور اگر تو چاہے کہ وہ پورا ہو جو میری مرضی ہے، میرے بندے! میں تیرے کاموں کو بھی سنوار دونگا اور تیرا مددگار بھی بن جاؤنگا۔

آسان طریقہ:

تو آسان طریقہ تو یہ ہے کہ ہم گناہوں کو چھوڑ دیں اور اللہ کے دروازے پر آ کر پڑ جائیں۔دعا مانگیں: میرے مولا! ہم جاہل بندے ہیں، ہم غافل بنے رہے، اللہ! ہم نے وہ کام کیے کہ آپ کے عذاب کو ہم نے دعوت دی، یہ تو آپ کا حلم ہے کہ ہم صحیح حال میں موجود ہیں، اب احساس ہوا کہ ہمارے گناہ ہی ہمارے راستے کی رکاوٹ ہیں۔اے اللہ! ان گناہوں کو چھوڑنے کے لیے آج آپ کے در پر آئے بیٹھے ہیں۔ اے اللہ! وہ نہ کرنا کہ جس کے ہم اہل ہیں، ہم اہل ہیں سزا کے، ہم اہل ہیں عذاب کے، ہم اہل ہیں ذلت وخواری کے۔اللہ وہ کرنا جس کے آپ اہل ہیں۔آپ اہل ہیں بخش دینے کے، آپ اہل ہیں رحم فرما دینے کے۔اللہ وہ نہ کرنا جس کے ہم اہل ہیں، اللہ وہ کرنا جس کے آپ اہل ہیں۔آپ کو غفاری سجتی ہے، ستاری سجتی ہے، حلم سجتا ہے، اے کریم آقا! ہم پر رحمت فرما دینا، ہمیں گناہوں سے محفوظ فرما دینا۔

﴿وَاٰخِرُ دَعْوٰنَا اَنِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ﴾

﴿كَلَّا بَلْ رَانَ عَلٰى قُلُوْبِهِمْ مَّا كَانُوْا يَكْسِبُوْنَ﴾
(مطففین:۱۴)

کیفیات کی حفاظت

بیان: محبوب العلماوالصلحا، زبدۃ السالکین، سراج العارفین
حضرت مولانا پیر ذوالفقار احمد نقشبندی مجددی دامت برکاتہم

تاریخ: 13 جنوری 2012ء بروز جمعہ، ۱۹ صفر ۱۴۳۳ھ

موقع: بیان جمعۃ المبارک

مقام: جامع مسجد زینب معہد الفقیر الاسلامی جھنگ

اقتباس

کبھی کبھی اللہ رب العزت آزمائش اور امتحان کے طور پر بندے سے کیفیات کو سلب کر لیتے ہیں، اسے ''قبض کی کیفیت'' کہا جاتا ہے۔ یہ قبض کی کیفیت عام طور پر یا معصیت کی وجہ سے ہوتی ہے، یا پھر امتحان کی وجہ سے ہوتی ہے۔

﴿وَاللّٰهُ يَقْبِضُ وَيَبْسُطُ وَاِلَيْهِ تُرْجَعُوْنَ﴾

کبھی اللہ تعالیٰ بہت کیفیات دے دیتے ہیں، بندے کو اللہ کی طرف یکسوئی اور جمعیت حاصل ہوتی ہے، اور کبھی اللہ تعالیٰ ایسی کیفیت طاری کر دیتے ہیں کہ بالکل بے حلاوتی ہوتی ہے، کچھ کرنے کو جی نہیں چاہتا۔ گویا قبض اور بسط دونوں حالات میں اللہ تعالیٰ آزماتے ہیں۔

(حضرت مولانا پیر ذوالفقار احمد نقشبندی مجددی مدظلہ)

کیفیات کی حفاظت

اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ وَکَفٰی وَسَلَامٌ عَلٰی عِبَادِہِ الَّذِیْنَ اصْطَفٰی اَمَّا بَعْدُ:
فَاَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنَ الشَّیْطٰنِ الرَّجِیْمِ o بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ o
﴿کَلَّا بَلْ رَانَ عَلٰی قُلُوْبِهِمْ مَّا کَانُوْا یَکْسِبُوْنَ﴾
سُبْحَانَ رَبِّکَ رَبِّ الْعِزَّةِ عَمَّا یَصِفُوْنَ o وَسَلَامٌ عَلَی الْمُرْسَلِیْنَ o
وَالْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ o
اَللّٰھُمَّ صَلِّ عَلٰی سَیِّدِنَا مُحَمَّدٍ وَّعَلٰی اٰلِ سَیِّدِنَا مُحَمَّدٍ وَّبَارِکْ وَسَلِّمْ

دوطرح کے سفر:

مومن کو اپنی زندگی میں دوطرح کے سفر کرنے کا واسطہ پڑتا ہے۔

......ایک جسمانی سفر

......دوسرا روحانی سفر

جسمانی سفر یہ ہے کہ ضرورت کی خاطر انسان کا ایک جگہ سے دوسری جگہ جانا، کسی کام سے ایک شہر سے دوسرے شہر جانا، بزنس کے لیے ایک ملک سے دوسرے ملک جانا۔ یہ مادی سفر ہے اور ضرورت کی بنا پر کیا جاتا ہے۔

دوسرا ہے روحانی سفر......وصول الی اللہ کا سفر۔

یہ سفر ہے:

......گناہوں سے نیکی کی طرف

......غفلت سے حضوری کی طرف

......دنیا سے آخرت کی طرف

......اور مخلوق سے خالق کی طرف

یہ سفر کرنا انسان پر فرض ہے۔ مخلوق سے کٹنا، خالق سے جڑنا اس کا ہمیں قرآن مجید میں حکم دیا گیا ہے۔

سفر کے لیے رہبر کی ضرورت:

ان دونوں سفروں میں ایک بات Common (مشترک) ہے۔ وہ یہ کہ اگر انسان اپنے آپ سفر شروع کرے تو دشواریاں زیادہ ہوتی ہیں۔ راستے کا پتہ نہیں ہوتا۔ کیا مشکلات پیش آئیں گی، اس کا اندازہ نہیں ہوتا۔ تو اگر رہبر کے بغیر ظاہری سفر بھی شروع کرے تو مشکلات کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ باطن کا سفر تو چونکہ اندھا دھند سفر ہے اور اس سفر کے اندر ایک راہزن بھی ہے جو قافلے کو لوٹتا ہے اور اس کا نام شیطان ہے۔ تو اس لیے اس سفر میں احتیاط اور زیادہ ضروری ہے۔

لوگ ظاہری سفر میں بھی رہبر متعین کرتے ہیں۔ جیسے نبی علیہ الصلوٰۃ والسلام جب ہجرت کے لیے تشریف لے گئے تو سیدنا صدیق اکبر رضی اللہ عنہ نے ایک کافر کو راستہ دکھانے کے لیے متعین کیا۔ ظاہر کا راستہ ہے، مگر سہولت کی خاطر، غلطی کوتاہی سے بچنے کے لیے اس کو متعین کیا کہ ہم آپ کو اتنا معاوضہ دیں گے، آپ ہمیں اس راستے سے فلاں جگہ پہنچا دیں۔ بھئی! اگر ظاہر کے راستے متعین کرنے کے لیے بھی رہبر کا ثبوت حدیث پاک سے ملتا ہے تو باطن کے راستے کے لیے بھی رہبر کی ضرورت پڑتی ہے۔

جب اس سفرِ ہجرت میں ایک شخص نے صدیق اکبر رضی اللہ عنہ سے پوچھا کہ بتائیے! آپ کے ساتھ یہ کون ہیں؟ تو انہوں نے بہت خوبصورت جواب دیا کہ یہ ایک بندہ ہے جو مجھے راستے کی رہنمائی کرتا ہے۔ وہ کہنا بھی نہیں چاہتے تھے کہ یہ نبی علیہ السلام ہیں کہ

کہیں بات ہی نہ کھل جائے۔ ایسی بات کی جو سو فیصد ٹھیک تھی کہ یہ وہ ہستی ہیں جو مجھے راستے کی رہنمائی کرتی ہے (دلائل النبوۃ للبیہقی: ۲/ ۳۹۸)۔ یہاں سے ثابت ہوا کہ روحانی راستے کے لیے بھی رہبر کا متعین کرنا ضروری ہے۔

روحانی سفر کی ابتدا:

اس روحانی سفر کی ابتداء شیخِ کامل سے بیعت ہونے سے شروع ہو جاتی ہے۔ بیعت کہتے ہیں: گناہوں سے سچی توبہ کرنے کو۔ جیسے فرمایا:

((قَالَ اِنِّیْ مُهَاجِرٌ اِلٰی رَبِّیْ))

''میں اپنے رب کی طرف ہجرت کر رہا ہوں''

اس بیعت کا بنیادی مقصد اللہ کی طرف ہجرت کا سفر شروع کرنا ہے۔

بیعت کی حکمت:

مولوی وکیل اللہ جان نے ایک مرتبہ حضرت سہارن پوری رحمۃ اللہ علیہ سے پوچھا: حضرت! بیعت کیا چیز ہے؟ تو حضرت نے فرمایا:

''اس میں مرید توبہ کرتا ہے مراد کو گواہ بنا کر''

حضرت نے طالب صادق کو ''مرید'' کہا اور شیخ کامل کو ''مراد'' کہا، کیونکہ جب دل کے اندر محبت ہو اور دل میں یہ بات راسخ ہو جائے کہ ان کا چہرہ دیکھنے سے مجھے اللہ یاد آتا ہے، ان کی مجلس میں بیٹھنے سے مجھے آخرت کی طرف رجوع ہوتا ہے، ان کے پاکیزہ کلام کو سن کر دل میں اللہ کی محبت بڑھتی ہے، انابت الی اللہ، رجوع الی اللہ کی کیفیت بڑھتی ہے، ان کے اعمال کو دیکھ کر سنت کی عملی صورت کو سمجھنا آسان ہو جاتا ہے تو پھر سالک چاہتا ہے کہ میں بھی اپنے شیخ کی طرح متبع سنت بن جاؤں۔ یوں

اتباع کے اندر یہ مرید بنا وہ مراد بنا۔

ہمارے گناہوں پر گواہ تو بہت ہیں۔ فرشتے بھی گواہ ہیں، زمین کے ٹکڑے بھی گواہ ہیں، حتی کے جسم کے اعضا بھی گواہ ہیں۔ تو ربِ کریم نے اس بات کو پسند کیا کہ اس کی نیکی پر بھی کوئی گواہ ہونا چاہیے۔ چنانچہ اس بیعت کو ایک سنت عمل بنا دیا کہ جب بھی کوئی بندہ سچی توبہ کرنا چاہے تو وہ شیخ کے پاس آ کر توبہ کرے۔ توبہ تو وہ گھر کے کونے میں بھی کر سکتا ہے مگر گواہی تو نہیں ہوگی۔ تو اس بیعت کی حکمت یہ ہے کہ رب کریم نے اپنے بندوں کے لیے پسند کیا کہ میرے بندو! تم نے اتنے گناہ کیے جن کے گواہ قیامت کے دن ہوں گے، کوئی تو تمہاری نیکی کی گواہی دینے والا بھی ہو۔ اب آپ سوچیے کہ اللہ کے مقرب بندوں میں سے کوئی بندہ قیامت کے دن ہماری توبہ پر گواہی دے دے تو ہمارا کام کتنا آسان ہو جائے۔

اذکار و اشغال:

جب ایک آدمی توبہ کر لیتا ہے تو پھر شیخ اس کو اعمال بتاتا ہے۔ ان کو کہتے ہیں اذکار اور اشغال۔ اذکار وہ ہوتے ہیں جو زبان سے پڑھے جاتے ہیں، جیسے: قرآن مجید کی تلاوت ہے، درود شریف کا پڑھنا، استغفار کا پڑھنا۔ اور اشغال ان اعمال کو کہتے ہیں جن کا تعلق قلب کے ساتھ ہو، جیسے مراقبہ کرنا، یہ اشغال میں سے ہے۔

معمولات میں استقامت اللہ کو پسند ہے:

اچھا سالک وہی ہوتا ہے جو ان معمولات میں ناغہ نہ ہونے دے۔ نبی علیہ الصلوٰۃ والسلام نے ارشاد فرمایا:

((اَحَبُّ الْاَعْمَالِ اِلَی اللّٰہِ اَدْوَمُھَا وَ اِنْ قَلَّ))(مسلم،رقم:۱۳۰۵)

''اللہ تعالیٰ کو پسندیدہ اعمال وہ ہیں جو مسلسل کیے جائیں اگر چہ وہ تھوڑے ہوں''

لمبے استغفار کرنے کی ضرورت نہیں ہے،سومرتبہ استغفار،سومرتبہ درود شریف ہی کافی ہے مگر ناغہ نہ ہو۔ چنانچہ جو صاحبِ استقامت لوگ ہوتے ہیں وہ ناغہ نہیں ہونے دیتے۔

ہمیں ایک مرتبہ ایک عالم ملے جنہوں نے حضرت خواجہ عبدالمالک صدیقی رحمۃ اللہ علیہ سے بیعت کی تھی۔فرمانے لگے کہ مجھے حضرت سے بیعت کیے اس وقت تینتالیس سال گزر چکے،تینتالیس سالوں میں میرا قرآن مجید کا ایک پارہ بھی قضا نہیں ہوا۔

جو حضرات استقامت کے ساتھ عمل کرتے ہیں پھر ان کے اعمال اللہ کو پسند بھی آجاتے ہیں۔اور اس پسندیدگی کی کیفیت دیکھیے کہ حدیثِ پاک میں ہے: جو بندہ صحت کے زمانے میں اعمال باقاعدگی سے کرتا ہے اگر بیمار ہوتا ہے تو اللہ تعالیٰ فرشتوں کو حکم دیتے ہیں کہ میرے بندے کے ان عملوں کو بن کیے اس کے نامۂ اعمال میں لکھ دیا جائے (البخاری،رقم:۲۹۹۶)۔رب کریم ناغہ پسند نہیں فرماتے۔ جب اللہ تعالیٰ نے اتنی چھوٹ دے دی کہ آپ نے صحت کی حالت میں یہ عمل کیے اب آپ بیمار ہیں تو ہم اجر دے دیتے ہیں،اس سے اندازہ لگائیے! اللہ کو استقامت کتنی پسند ہے۔

معمولات میں استقامت کیسے ہو؟

سالک کو چاہیے کہ ایک ڈائری بنائے اور اس میں روزانہ کا معمول لکھے۔اگر کسی تقاضے کی وجہ سے،یا کسی ضرورت کی وجہ سے کوئی عمل قضا ہو تو اگلے دن پھر اس کو ادا

کرے۔عوام الناس تو فرض نمازوں کی قضا کرتے ہیں، لیکن جو سالکین ہوتے ہیں وہ اورادو وظائف کی بھی قضا کرتے ہیں۔ ان کی نظر میں اس کی بھی بہت اہمیت ہوتی ہے۔وہ اس کو اپنی طرف سے اللہ رب العزت کے حضور ہدیہ اور تحفہ سمجھ کر بھیجتے ہیں۔ اگر آپ کا بیٹا، بھائی یا کوئی قریبی عزیز پردیس میں ہو اور وہ روزانہ آپ کو خیریت کی اطلاع دے، میسج کرے، تو کسی دن اس کا میسج نہ آئے تو انتظار رہتا ہے نا کہ اللہ خیر کرے معلوم نہیں آج اس نے خیریت کی اطلاع کیوں نہیں دی۔ جس طرح ہمیں انتظار ہوتا ہے اسی طرح پروردگارِ عالم کو بھی اپنے بندوں کے بھیجے ہوئے ہدیے اور تحفے کا انتظار ہوتا ہے کہ میرے چاہنے والے مجھے تحفہ بھیجیں اور اپنی محبتوں کا اظہار کریں۔ محبت کا اظہار یہی اورادو وظائف ہیں۔

علما طلبا کا مغالطہ:

اس میں طلبا کو یا علما کو زیادہ مغالطہ پڑتا ہے، کیونکہ عوام الناس کو تو پتہ ہے کہ ہمیں یہ کام کرنا ہے، لیکن جو پہلے سے دین کے کام میں لگے ہوتے ہیں ان کو شیطان مغالطہ ڈالتا ہے کہ جی! آپ تو پہلے ہی دین کا کام کر رہے ہیں۔

......آپ تو مطالعہ بھی کرتے ہیں۔

......آپ تو سبق بھی پڑھاتے ہیں۔

......اور آپ کا وقت تو حدیث پاک کی خدمت میں گزرتا ہے۔

اس طرح ثواب تو مل ہی جاتا ہے۔ واقعی! جو دن میں دین کا کام کرتا ہے، حدیثِ پاک کے مطابق اس کو تہجد کا بھی ثواب مل جاتا ہے۔ لیکن صحابہ کی حالت دیکھیے! وہ بھی تو سارا دن دین کا کام کرتے تھے لیکن اپنی تہجد کو کبھی قضا نہیں ہونے دیتے تھے۔ کیوں؟ اس لیے کہ وہ اس کی اہمیت کو سمجھتے تھے۔

مدرسین کا نصب العین

اگر ایک شخص عالم ہے یا مدرس ہے تو اس کی زندگی کی ترتیب اور ہے، چونکہ مجمع میں علما اور طلبا ہیں اس لیے اس بات کو خصوصی طور پہ بیان کیا جاتا ہے کہ مدرس کا نصب العین کیا ہونا چاہیے؟

☆......روزانہ مطالعہ:

پہلی بات تو یہ کہ وہ کتابوں کا مطالعہ روزانہ کرے۔ اس میں بھی کوتاہی دیکھی جاتی ہے۔ اگر کسی کو پانچ چھ سال پڑھاتے ہوئے گزر گئے تو بعض حضرات فخر محسوس کرتے ہیں کہ میں تو جی بغیر مطالعے کے پڑھا لیتا ہوں۔ بھئی! بغیر مطالعہ کے آپ یقیناً پڑھا سکتے ہیں مگر اس بات کو ذہن میں رکھیں کہ مطالعہ جب بھی کیا جاتا ہے۔ اللہ کی طرف سے ہر مرتبہ کوئی نہ کوئی معرفت عطا کی جاتی ہے، لہٰذا ہر سبق پڑھانے سے پہلے اہتمام کے ساتھ کتاب کو پڑھنا چاہیے معلوم نہیں کتنے نکتے کھلنے کا سبب بنے گا۔ اللہ تعالیٰ کی طرف سے وہبی علوم ملنے کا سبب بنے گا۔ صرف کتابی علوم تو نہیں ہوتے، اللہ تعالیٰ بات کو دل پر کھول دیتے ہیں۔ اس لیے کتاب کا مطالعہ اپنے اوپر لازم سمجھیں، بھلے کتاب زبانی ہی کیوں نہ یاد ہو۔

☆......طلبا کو اپنا محسن سمجھیں:

دوسری بات یہ کہ طلبا کو اپنا محسن سمجھیں کہ ان طلبا نے علم کی تخم ریزی کے لیے اپنے دلوں کی زمین کو پیش کر دیا۔ اگر یہ نہ ہوتے تو انسان کیا درختوں کو پڑھاتا؟ بالآخر طلبا ہی کو پڑھانا ہے۔ یہ طلبا کا استاد پر احسان ہے کہ انہوں نے اس کو علم کی

خدمت کرنے کا موقع دیا، ان کو علم کے بیج اپنے دل کی زمین میں بونے کا موقع دے دیا۔

☆......طلبا سے شفقت کریں:

تیسری بات یہ کہ طلبا کے ساتھ شفقت کا معاملہ کریں۔ انسان کی اولاد دو طرح کی ہوتی ہے، ایک ''صلبی اولاد'' کہلاتی ہے جو انسان کے نسب کے اعتبار سے اولاد کہلاتی ہے جیسے بیٹے، بیٹیاں۔ اور ایک روحانی اولاد ہوتی ہے جن پر انسان دین کی محنت کرتا ہے۔ ایک مرتبہ حضرت مرشد عالم رحمۃ اللہ علیہ کوئی بات کر رہے تھے، ایک طرف حضرت کے خلیفہ صاحب تھے اور دوسری طرف صاحبزادہ صاحب کوئی اور بات کر رہے تھے۔ حضرت نے اپنے صاحبزادے کو ذرا سختی سے سمجھایا اور فرمایا: دیکھو! یہ میرے سینے کی اولاد ہے اور تم میرے پیشاب کی اولاد ہو۔ اس سے اندازہ لگائیں کہ اہل اللہ کے دل میں جو دین سیکھنے والے شاگرد ہوتے ہیں ان کا کیا مقام ہوتا ہے۔

☆......طلبا کی اصلاح کی کوشش کرتے رہیں:

چوتھی بات یہ کہ طلبا کی اصلاح کے لیے کوشش کرتے رہیں: ﴿إِنِّیْ لَکُمْ نَاصِحٌ أَمِیْـــــنٌ﴾ بن کر۔ یہ انبیا کا کام ہوتا ہے۔ علما چونکہ انبیا کے وارث ہیں لہٰذا علما کو بھی چاہیے کہ وراثت کا حق ادا کریں اور اس کو اپنا فرض منصبی سمجھیں۔ صرف یہی نہیں کہ طالب علم آیا تو ہم نے (ضَرَبَ یَضْرِبُ ضَرْبًا فَهُوَ ضَارِبٌ) پڑھا دیا۔ نہیں! اس کی عادات و اخلاق کا خیال رکھنا، اس کو شفقت پیار سے سمجھانا، نیکی کی طرف متوجہ کرنا، یہ استاد کا کام ہوتا ہے۔ اور ہم نے یہ دیکھا کہ اللہ تعالیٰ نے طلبا کے دلوں میں

استاد کا ایسا احترام ڈالا ہوتا ہے کہ کئی مرتبہ اگر والد وہی بات کہے تو شاید عمل میں کوتاہی ہو جائے مگر، استاد کہہ دے تو شاگرد اس پر عمل کر لیتا ہے۔ اس لیے اس کی یہ بھی ذمہ داری ہے لوگوں کے دلوں میں دین کی محبت کو پیدا کرے۔ یہ سب سے افضل عمل ہے۔

قرآن مجید کی آیت ہے:

﴿قُلْ هٰذِهٖ سَبِيْلِيْٓ اَدْعُوْٓا اِلَى اللّٰهِ﴾ (یوسف:۱۰۸)

''کہہ دیجیے: یہ میرا راستہ ہے کہ میں (لوگوں کو) اللہ کی طرف بلاتا ہوں''

اللہ کی طرف بلانے کا کیا معنی ہے؟ اللہ کی محبت دلوں میں پیدا کرنا۔ محبت پیدا ہوگئی تو اعمال خود بخود آتے جائیں گے، لہٰذا اللہ تعالیٰ کی محبت دلوں میں پیدا کرنا زندگی کا بہترین عمل ہے۔ ایک حدیثِ مبارکہ میں آتا ہے:

''قیامت کے دن اللہ تعالیٰ ان لوگوں کو نور کے منبروں پر بٹھائیں گے جو مخلوق کو اللہ کا محبوب بنائیں گے اور اللہ کو مخلوق کا محبوب بنائیں گے''

صحابہ رضی اللہ عنہم نے پوچھا: اے اللہ کے حبیب صلی اللہ علیہ وسلم! اللہ کو مخلوق کا محبوب بنائیں گے یہ بات تو سمجھ میں آتی ہے کہ اللہ کی عظمت بیان کریں گے، اللہ کے فضل و کرم کے تذکرے کریں گے، اللہ کی رحمت کے تذکرے کریں گے، کہ مخلوق اللہ سے محبت کرنے لگ جائے، لیکن مخلوق کو اللہ کا محبوب کیسے بنائیں گے؟ نبی علیہ السلام نے فرمایا: وہ لوگوں کو نیکی کی تلقین کریں گے، جب وہ نیکی پر آئیں گے اور نیک اعمال کو اپنا لیں گے تو اللہ کے محبوب بن جائیں گے۔ (کنز العمال، رقم:۵۵۶۵)

☆......اخلاص اور اختصاص کو لازم کریں:

اچھا استاد وہ ہوتا ہے جس میں دو خوبیاں ہوں:

(۱)......اخلاص بھی ہو۔

(۲)......اختصاص بھی ہو۔

اخلاص کا معنی یہ ہے کہ جو علم پڑھائے اللہ کی رضا کے لیے پڑھائے اور اختصاص کا معنی ہے کہ جو وہ پڑھا رہا ہے اس میں اسے تخصص بھی حاصل ہو۔ جو کتاب پڑھا رہا ہو اس کے اندر خوب محنت کرے۔ اگر استاد میں یہ دو نعمتیں اکٹھی ہو جائیں: یعنی اخلاص اور اختصاص تو ایسا استاد اللہ کے ہاں مقبول ہو جاتا ہے۔ اس کے علم کا فیض جاری ہو جاتا ہے۔

☆......خلوت کو لازم سمجھیں:

مدرسین خلوت کو لازم سمجھیں! اللہ تعالیٰ اپنے پیارے حبیب ﷺ کو فرماتے ہیں:

﴿فَإِذَا فَرَغْتَ فَانْصَبْ﴾ (الم نشرح:۷)

''جب آپ اپنے منصب سے فارغ ہو جائیں تو آپ اللہ کی طرف رغبت کریں''

طالب علم یا دین کے پڑھانے والے چونکہ نبی علیہ السلام کے وارث ہیں، اس لیے ان کی بھی یہی ترتیب ہونی چاہیے کہ مطالعہ کریں، مدرسے میں کتابیں پڑھائیں، طلبا پر محنت کریں، لیکن جیسے ہی فارغ ہوں تو ﴿فَإِذَا فَرَغْتَ فَانْصَبْ﴾ پر عمل کرتے ہوئے خلوت میں اللہ کی طرف رجوع کریں۔ ایک استاد اور عالم کے لیے نصب العین یہی ہے کہ وہ علم کو مقدم کرے، مگر اپنے اوراد و وظائف کے لیے خلوت بھی ضرور اختیار کرے۔ چاہے اس کے لیے دن کا وقت ہو یا رات کا لیکن رجوع الی اللہ کا کچھ وقت ہونا ضرور چاہیے۔

طالب علم کے لیے نصب العین

اسی طرح طالب علم کے لیے بھی نصب العین ہے۔

○ نیت درست کرے:

طالب علم کا سب سے بڑا مقصد یہ ہے کہ کتابوں کو پڑھ کر یہ معلوم کرے کہ اللہ تعالیٰ کو کون سی باتیں پسند ہیں اور کون سی باتیں ناپسند ہیں۔ ایک موٹی سی بات ذہن میں رکھنے والی ہے کہ کتابوں کو اس نیت سے پڑھیں کہ میں معلوم کرنا چاہتا ہوں کہ اللہ کن باتوں سے راضی ہوتے ہیں اور کن باتوں سے ناراض ہوتے ہیں۔ اللہ رب العزت نیکی سے راضی ہوتے ہیں اور گناہ سے ناراض ہوتے ہیں۔ نیکی کیا ہے اور گناہ کون سے ہیں، اس کو علم کے ذریعے سمجھنے کی کوشش کرے۔

○ علم پر عمل کرے:

جب یہ پتہ چل گیا کہ اللہ تعالیٰ گناہ سے ناراض ہوتے ہیں، تو جس جس گناہ کا پتہ چلتا جائے اسے چھوڑتا جائے۔ جب پتہ چل گیا کہ نیکی سے اللہ راضی ہوتے ہیں تو جس جس نیکی کے بارے میں پڑھتا جائے اس کو عمل میں لاتا جائے۔ ایسے طالب علم کی زندگی اللہ رب العزت کی رضا والی زندگی بن جاتی ہے۔ اس لیے بزرگوں نے کہا:

"علم، عمل کو تلاش کرتا ہے، مل جائے تو باقی رہتا ہے، ورنہ ہمیشہ کے لیے رخصت ہو جاتا ہے۔"

جو استاد یا طالب علم اس طرح زندگی گزارے گا اس کے سینے میں نسبت کا نور بہت جلدی آئے گا اور اس کے دل کو منور کر دے گا۔

نورِ نسبت کی پہچان:

اکثر دوست یہ بھی پوچھتے ہیں: جی! یہ نسبت ہوتی کیا ہے؟ تو اس کو آسان لفظوں میں یوں سمجھ لیجیے کہ

⊙ ......ایسا نور کہ جب وہ حاصل ہو جاتا ہے تو انسان کو اپنے علم پر عمل کیے بغیر چین نہیں آتا، اس کو ''نسبت کا نور'' کہتے ہیں۔ یا دوسرے لفظوں میں اعمالِ صالحہ کی توفیق بڑھ جانا، مثلاً: مسنون دعائیں بھی پڑھنا ...... باوضو بھی رہنا......توجہ الی اللہ بھی رہنا...... گناہوں سے بھی بچنا......نماز بھی بہتر ہو جانا۔تو اعمالِ صالح کی توفیق بڑھ جانا، یہ بھی نسبت کا نور کہلاتا ہے۔

⊙ ......گناہ کے مواقع سے بچ جانا، یہ بھی نسبت کے نور کی علامت ہے۔

⊙ ......ایک علامت یہ ہے کہ انسان کو یہ فکر لگ جائے کہ اللہ مجھ سے راضی ہو جائے۔ طبیعت پر ایک غم طاری ہو جائے......ایک ولولہ دل میں سما جائے......ایک شوق دل میں پیدا ہو جائے ...... ہر وقت دل میں یہ جذبہ رہے کہ میں اللہ کو راضی کرلوں۔ جب قلب کی یہ کیفیت ہو جائے تو یہ اس بات کی علامت ہے کہ دل میں نسبت کا نور پیوست ہو چکا ہے۔

پھر ایسا بندہ راتوں کو گھوڑے بیچ کے نہیں سوسکتا۔ ؎

ہمارا کام ہے راتوں کو رونا یادِ دلبر میں
ہماری نیند ہے محوِ خیال یار ہو جانا

حدیث پاک میں فرمایا گیا:

((وَ الصَّلٰوةُ بِا للَّيْلِ وَ النَّاسُ نِيَامٌ)) (الترمذی، رقم:۳۱۵۷)

''جب لوگ سوئے پڑے ہوتے ہیں یہ اللہ کا بندہ اٹھ کر اللہ کی یاد میں لگا ہوتا

ہے، اللہ سے راز و نیاز میں لگا ہوتا ہے۔''

⊙ ......صاحبِ نسبت بندہ، ایسا بندہ ہوتا ہے جس کا رجوع الی اللہ ایسا ہو کہ اس کو خوشی ملے تو بھی اللہ کی طرف رجوع کرے، غم ملے تو بھی اللہ کی طرف رجوع کرے۔ غم بھی اس کو اللہ کے قریب کرتا ہے اور خوشی بھی اس کو اللہ کے قریب کرتی ہے۔

ہمارے بزرگوں نے تو یہاں تک فرمایا کہ خوشی کے حالات میں انسان کی ترقی اتنی زیادہ نہیں ہوتی جتنی غم اور پریشانی کے اوقات میں انسان کی ترقی ہوتی ہے۔ اس لیے بزرگوں نے کہا:

سکھ دکھاں توں دیواں وار
دکھاں آن ملایم یار

''میں سکھوں کو دکھوں پر قربان کر دوں، ان دکھوں نے مجھے میرے یار سے ملا دیا۔''

تو ایسا بندہ مصائب کو بھی اللہ کی نعمت سمجھتا ہے۔

دکھ آنے پر حضرت بایزید بسطامی رحمۃ اللہ علیہ کی کیفیت:

ایک دفعہ حضرت بایزید بسطامی رحمۃ اللہ علیہ نے جمعہ کے دن غسل کیا۔ نئے صاف ستھرے کپڑے پہنے اور مسجد کی طرف چلے۔ اللہ کی شان کہ کسی عورت نے گھر کی چھت کے اوپر جھاڑو دیا تو اس نے بِن دیکھے کہ گلی میں کوئی گزر رہا ہے یا نہیں، اوپر سے کوڑا کرکٹ نیچے پھینک دیا۔ وہ سارے کا سارا کوڑا کرکٹ بایزید بسطامی رحمۃ اللہ علیہ کے سر کے اوپر آ کر گرا......اب عام آدمی کوئی ہوتا تو اسے غصہ آتا کہ یہ کس نے بری حرکت کی......مگر بایزید بسطامی رحمۃ اللہ علیہ نے اللہ کا شکر ادا کرنا شروع کر دیا۔ کسی نے پوچھا: حضرت! سر میں مٹی کا پڑ جانا، یہ بھی کوئی شکر کرنے والی بات ہے؟ کہنے لگے:

ہاں! میں اس قابل تھا کہ میرے اوپر آگ کے انگارے برسائے جاتے، میں کیوں نہ اللہ کا شکر ادا کروں کہ جس نے فقط سر پر مٹی ڈال کے قصے کو ختم کر دیا۔ اس سے پتہ چلا کہ جب دل اللہ کی طرف متوجہ ہوتا ہے تو خوشی ہو یا غم ہو، انسان اللہ کی طرف رجوع کرتا ہے۔

کیفیات کا سلب ہونا

ہاں! کبھی کبھی اللہ رب العزت آزمائش اور امتحان کے طور پر بندے سے کیفیات کو سلب کر لیتے ہیں، اسے ''قبض کی کیفیت'' کہا جاتا ہے۔ یہ قبض کی کیفیت عام طور پر یا معصیت کی وجہ سے ہوتی ہے، یا پھر امتحان کی وجہ سے ہوتی ہے۔

﴿وَاللّٰهُ يَقْبِضُ وَيَبْسُطُ وَاِلَيْهِ تُرْجَعُوْنَ﴾ (البقرة:۲۴۵)

کبھی اللہ تعالیٰ بہت کیفیات دے دیتے ہیں، بندے کو اللہ کی طرف یکسوئی اور جمعیت حاصل ہوتی ہے، اور کبھی اللہ تعالیٰ ایسی کیفیت طاری کر دیتے ہیں کہ بالکل بے حلاوتی ہوتی ہے، کچھ کرنے کو جی نہیں چاہتا۔ گویا قبض اور بسط دونوں حالات میں اللہ تعالیٰ آزماتے ہیں۔

حالتِ قبض سے نکلنے کے دو راستے

اگر قبض کی کیفیت طاری ہو تو اس سے نجات کے دو راستے ہیں۔

(۱) حدیث کثرتِ استغفار

ایک تو یہ کہ انسان کثرت کے ساتھ استغفار کرے۔ یہ استغفار انسان کے دل پر جو ظلمت کے پہاڑ ہوتے ہیں ان کو بھی ہٹانے میں کامیاب ہو جاتا ہے۔ لہٰذا استغفار

زیادہ سے زیادہ کریں۔ پاک میں آتا ہے کہ اللہ کے حبیب ﷺ ایک ہی مجلس میں کم و بیش ستر مرتبہ استغفار فرمایا کرتے تھے۔ (صحیح البخاری، رقم: ۶۳۰۷)

(۲) شیخ سے توجہات لینا:

اور دوسری بات یہ کہ اپنے شیخ سے توجہات لے۔ ان کو اطلاع دے تاکہ وہ بھی توجہات دیں۔ ان کی توجہات سے سالک اس کیفیت سے نکل آتا ہے۔

جب حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ گرفتار ہو گئے اور مالٹا پہنچائے گئے تو جو متعلقین تھے، ان کے دلوں کے اوپر عجیب کیفیت تھی ۔ حضرت مولانا مفتی کفایت اللہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ اس وقت بہت جوان تھے، مگر دل کی کیفیت ایسی تھی کہ کچھ کرنے کو دل نہیں چاہتا تھا۔ فرماتے ہیں کہ کبھی دل میں خیال آتا کہ اس جینے سے مرجانا بہتر ہے۔ گویا خودکشی کا دھیان آتا۔ کبھی میں کنویں کے پانی میں نیچے دیکھتا تو خیال آتا کہ میں اس میں چھلانگ لگا دوں۔ اس طرح کے مجھے خیالات آتے۔

وہ میرٹھ میں تھے، وہاں سے دیوبند آئے اور دیوبند سے پھر وہ سہارن پور آئے جہاں سے ان کو آگے تھانہ بھون جانا تھا۔ اللہ کی شان کہ وہ جو تھانہ بھون جانے والی ٹرین تھی وہ مس ہو گئی۔ انہوں نے سوچا کہ میں آج رات یہیں قیام کر لیتا ہوں ۔ حضرت مولانا خلیل الرحمن سہارنپوری رحمۃ اللہ علیہ اس وقت سہارنپور میں موجود تھے۔ وہ بڑے بھاری عالم بھی تھے اور ایک بڑے شیخ بھی تھے مگر حضرت مفتی صاحب کے سامنے ان کا علم تو کھلا تھا، ان کا باطنی کمال نہیں کھلا ہوا تھا۔ تو وہ سمجھتے تھے کہ ہاں! بس ایک اچھے عالم ہیں بس۔ لیکن اب وہاں رہے...... جب انسان کو ضرورت پڑتی ہے تو وہ ہر کسی سے مدد مانگتا ہے۔ (طَالِبُ الْغَرَضِ مَجْنُوْنٌ)...... چنانچہ انہوں نے

حضرت سہارنپوری رحمۃ اللہ علیہ سے کہا کہ حضرت! میرے دل کی یہ حالت ہے کہ کچھ کرنے کو دل نہیں چاہتا، مجھے بتائیں! میں کیا کروں؟ انہوں نے فرمایا: آپ یہیں رات قیام کریں اور تہجد کے اوقات میں جہاں میں بیٹھ کر ذکر کروں میرے قریب کہیں بیٹھ کر نفی اثبات کا ذکر کر لینا۔ کہا: بہت اچھا۔

کہتے ہیں کہ جب میں رات کو اٹھا اور نفی اثبات کرنے لگا...... **لا الہ الا اللہ** ......کا ذکر، تو مجھے ایسے لگ رہا تھا کہ جیسے کوئی چیز آ رہی ہے اور میرے دل کو نچوڑ رہی ہے اور دل میں سے کوئی کالی کالی چیز نکل رہی ہے۔ یعنی دل کے دھلنے کی کیفیت تھی۔ صبح میں اٹھا تو میری طبیعت میں پہلے کی نسبت کچھ افاقہ تھا۔ اب مجھے تھانہ بھون جانا تھا، میں نے حضرت مولانا خلیل الرحمٰن سہارنپوری رحمۃ اللہ علیہ کے پاس آیا اور عرض کیا کہ جی! مجھے جانا ہے۔ تو انہوں نے فرمایا کہ آپ جائیں، واپسی پر ایک دن پھر یہاں کے لیے لے کے آنا۔ وہ کہتے ہیں کہ میں تھانہ بھون گیا، وقت گزارا اور واپسی پہ ایک دن کے بجائے دو دن لے کر آ گیا۔ اب جو رات کو میں نے قیام کیا تو حضرت سہارنپوری رحمۃ اللہ علیہ میرے قریب بیٹھے۔ وہ بھی نفی اثبات کر رہے تھے، میں نے بھی کرنا شروع کر دیا۔ اب مجھے ایسے لگ رہا تھا کہ جیسے کوئی سفید نور قسم کی چیز ہے جو میرے دل میں داخل ہو رہی ہے۔ حتی کہ اللہ رب العزت نے وہی کیفیتیں واپس لوٹا دیں جو پہلے ہوا کرتی تھیں۔ تو وہ فرماتے ہیں کہ پہلے سفر میں جب میں آیا تو علمی عقیدت تو تھی لیکن روحانی عقیدت نہ تھی، اس لیے اس وقت پورا کام نہیں ہو سکا تھا آدھا کام ہوا تھا یعنی ظلمت ختم ہو گئی۔ اس ظلمت کے ختم ہونے پر عقیدت بڑھ گئی کہ یہ روحانی طور پر بھی بڑے شیخ ہیں۔ اب اگلی ایک مجلس نے دل کی دنیا کو بدل کے رکھ دیا۔

کیفیات سلب ہونے کی وجوہات

آجکل سالکین میں یہ شکوہ عام ہے کہ

......جی! اعمال میں رغبت نہیں رہی

......نماز میں دلچسپی نہیں

......تلاوت کو دل نہیں کرتا

......مراقبہ کو دل نہیں کرتا۔

چونکہ یہ عام شکایت ہے، اس لیے آج کی اس مجلس میں اس بات کو کھول دینا ضروری ہے۔

حضرت مولانا رشید احمد گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ سے کسی نے پوچھا: حضرت! میرے دل میں اعمال کی وہ رغبت نہیں رہی جو پہلے تھی، ایسے لگتا ہے کہ توفیق ہی چھن گئی، میں کیا کروں؟ تو حضرت نے کیفیات کے چھن جانے کی تین وجوہات بیان کیں۔ محترم جماعت! اس بات کو دل کے کانوں سے سنیں اور اس کو اپنے دلوں میں جگہ دیں۔

1 ناجنس کی صحبت

ناجنس کی صحبت پہلا سبب ہے کیفیات کے ختم ہو جانے۔ ناجنس سے ایسا بندہ مراد ہوتا ہے کہ جس نہج پر آپ زندگی گزار رہے ہیں وہ اس سے ہٹ کر زندگی گزارنے والا ہو۔ مثال کے طور پر ایک آدمی کسی دنیادار کی مجلس میں بیٹھ گیا تو ہم نے دیکھا کہ اس ایک مجلس میں ہی اس کے دل کی کیفیات چھن جاتی ہیں۔ اس لیے کہ دنیا کی محبت جو اس کے دل میں ہے۔ وہ اس کے دل پر اثر انداز تو ہو گی۔ تو ناجنس سے مراد یہ نہیں کہ غیر محرم کی صحبت یا بے ریش لڑکوں کی صحبت...... یہ تو ہیں ہی سہی، اس

ناجنس میں وہ تمام دوست بھی شامل ہیں جو اس محنت میں نہیں لگے، جس میں آپ لگے ہوئے ہیں، لہٰذا دنیا دار دوستوں کے ساتھ بیٹھ کر گپ شپ کرنا دل پہ ظلمت آنے کا سبب بن جاتا ہے۔

عاملوں کی نحوست:

کئی لوگوں کو عاملوں کے پاس جانے کا بڑا شوق ہوتا ہے۔ وہ کہتے ہیں: جی! پتہ کرواؤ کیا ہوا؟ اور اکثر عامل شریعت کے مطابق اعمال نہیں کرتے۔ آج کے دور میں کئی سفلی علم کرتے ہیں، کئی کالا علم کرتے ہیں، جادو ٹونا وغیرہ تو ایمان کے ہی ضائع ہونے کا سبب بن جاتا ہے۔ اس لیے عاملین کی صحبت کئی مرتبہ قلب کی کیفیات کے سلب ہونے کا ذریعہ بن جاتی ہے۔

پنڈت کو دیکھنے کا وبال:

سہارن پور مدرسہ میں ایک نو مسلم طالب علم تھا...... عصر کے بعد طلبا کھیل کود میں مصروف ہوتے ہیں...... یہ بھی ذرا شہر سے باہر نکل کے واک کیا کرتا تھا۔ ایک مرتبہ وہاں سے پنڈت گزر رہے تھے تو یہ شوق سے دیکھنے لگ گیا کہ یہ لوگ کیا ہیں؟ اب ان کے جسم کا زیادہ حصہ ننگا اور تھوڑا حصہ ڈھکا ہوا تھا۔ وہ تو اپنے ہندو مذہب کے مطابق کر رہے تھے اور یہ شوق سے دیکھتا رہا۔ جب وہاں سے اٹھ کر مدرسے واپس آیا تو دل کی جو کیفیت تھی وہ سب کی سب سلب ہو چکی تھی۔ اس نے آ کر حضرت مولانا شیخ الحدیث زکریا رحمۃ اللہ علیہ سے کہا: حضرت! مجھے تو لگتا ہے میں اپنا سب کچھ لٹا بیٹھا ہوں اور اس کی آنکھوں میں آنسو تھے۔ حضرت شیخ الحدیث رحمۃ اللہ علیہ نے اسے فرمایا: اچھا! ایسے کرو کہ تم رائے پور چلے جاؤ...... اس زمانے میں رائے پور کو ذکر کا مرکز سمجھا جاتا

تھا، شاہ عبدالقادر رائے پوری رحمۃ اللہ علیہ وہاں موجود تھے...... چنانچہ وہ نومسلم طالب علم وہاں گیا اور حضرت کو جا کر اس نے یہ ساری بات بتائی۔ حضرت رحمۃ اللہ علیہ نے اس کو تین دن اپنے پاس رکھا۔ اللہ تعالیٰ نے تین دنوں میں دل کی ساری ظلمت کو دھو دیا۔

ایک عامل کی صحبت کا اثر:

ایک نوجوان کسی عامل کے پاس چلا گیا۔ وہاں سے اٹھ کر آیا تو اب اس کا نماز کو دل نہیں کرتا تھا، اللہ تعالیٰ کے بارے میں دل میں وسوسے آ رہے ہیں، نبی علیہ السلام کی شان کے بارے میں دل میں وسوسے آ رہے ہیں۔ چنانچہ وہ بہت پریشان ہوا۔ کسی اللہ والے کی صحبت میں گیا اور عرض کیا: حضرت! میرا تو یہ حال ہو گیا۔ وہ صاحبِ کشف تھے۔ فرمانے لگے: تم نے کوئی نہ کوئی ایسا عمل کیا ہے کہ میں تمہارے دل کے اوپر کافر لکھا ہوا دیکھ رہا ہوں۔ پھر اس نے بتایا کہ میں اس طرح عملیات والے کے پاس چلا گیا تھا۔ پھر ان بزرگوں نے اس کے لیے دعا کی اور توجہ دی۔ اللہ رب العزت نے ظلمت والے دل کو پھر سے منور فرما دیا۔

2 مشتبہ غذا

کیفیات سلب ہونے کی دوسری وجہ مشتبہ غذا ہے۔ ہم جو کھانا کھاتے ہیں اسی سے ہمارا گوشت بنتا ہے اور اسی کے اثرات ہمارے دل پر بھی پڑتے ہیں۔ اگر کھانا کسی نمازی نے بنایا ہو، باوضو ہو کے بنایا ہو، قرآن پاک کا ذکر کرتے ہوئے بنایا ہو تو اس کھانے کے اندر نور ہوتا ہے۔ ہمیں اس کا سابقہ پڑتا رہتا ہے۔ کئی گھروں میں جاتے ہیں تو میزبان بتاتے ہیں کہ حضرت! آپ کا کھانا بناتے ہوئے میری اہلیہ نے گیارہ مرتبہ سورۃ یٰسین شریف پڑھی۔ کئی مستورات درود شریف کی کثرت کرتی ہیں،

استغفار کی کثرت کرتی ہیں۔ یہ صحابیات کا عمل ہے۔ایک صحابیہ کا واقعہ ہے کہ انہوں نے تنور سے روٹی لگوائی اور جب لے کر گھر جانے لگیں تو فرمانے لگیں: لے بہن میری روٹی بھی پک گئی اور میرے دو پارے قرآن کی تلاوت بھی ہوگئی۔ پتہ چلا کہ یہ عورتیں تنور پہ جتنی دیر بیٹھ کر روٹی کا انتظار کرتی تھیں، زبان سے قرآن پڑھا کرتی تھیں۔اس سے پھر کھانے کے اندر نور آتا ہے اور اس کھانے سے پھر انسان پر کیفیات آتی ہیں۔

حلال مال کی برکت:

ایک بزرگ تھے۔وہ ننھے میاں کہلاتے تھے۔ان کا کام تھا، گھاس کاٹنا اور بیچنا۔ معمولی سی آمدنی تھی، مگر وہ اس میں سے روزانہ تھوڑا تھوڑا، ایک ایک پیسہ بچاتے رہتے تھے۔ سال کے بعد ان کے پاس اتنے پیسے ہوجاتے تھے کہ وہ دارالعلوم دیوبند کے اساتذہ کی دعوت کیا کرتے تھے۔ اساتذہ فرماتے تھے کہ ہمیں ان کی دعوت کا پورا سال انتظار رہتا تھا۔ کیونکہ جب ان کے گھر جا کر ہم کھانا کھاتے تھے تو بعد میں چالیس دن تک ہماری نمازوں کی حضوری میں اضافہ ہوجاتا تھا۔ یوں حلال، طیب اور پاکیزہ مال دل کو منور کر دیتا ہے اور حرام اور مشتبہ مال دل کی ظلمت کو بڑھا دیتا ہے۔

مشتبہ غذا سے بچنے کی عادت:

ہم اس بارے میں آج اتنے محتاط نہیں ہیں جبکہ ہمارے بزرگ تو اس کا بہت اہتمام فرماتے تھے۔ آج ہمیں بھی مشتبہ غذا سے بچنا چاہیے......آمدنی بھی ٹھیک ہو......سود بھی شامل نہ ہو...... رشوت بھی نہ ہو......غصب کا مال بھی شامل نہ ہو...... بددیانتی کا مال بھی شامل نہ ہو...... ہر چیز سے پاک مال ہو...... پھر اس مال سے جو چیز

بنے وہ بھی ٹھیک طریقے سے بنائی گئی ہو۔ کھانا کھاتے ہوئے یہ دیکھنا کہ یہ حلال مال سے حاصل ہوا یا حرام سے، یہ سالک پر فرض ہوتا ہے۔ یہ نہیں ہے کہ جہاں جا کر بیٹھے، جو چیز سامنے رکھ دی، چلو جی اندر۔ کوئی ٹریش کین......تھوڑا ہے! جو چیز ہم کھا رہے ہیں ہمارے اوپر اس کے اثرات مرتب ہوں گے۔ آج لوگ حرام کا مال اپنی اولادوں کو کھلاتے ہیں اور پھر ان کے کرتوتوں کا واویلا کرتے پھرتے ہیں۔ بھئی! جب آپ نے حرام کا مال اپنے بیٹے کو کھلایا اور اس سے اس کا گوشت بنا تو یہ گوشت اس وقت تک آرام نہیں پائے گا جب تک گناہ کا ارتکاب نہیں کر لے گا۔ اس کو گدگدی ہوتی رہے گی۔ یہ گدگدی گناہ کر کے ہی ختم ہوگی۔ تو قصور اِس کا نہیں تھا، قصور تو اُس کا تھا جس نے اس کو حرام کھلا دیا۔

اس لیے ہمارے سلف صالحین کی جو عورتیں تھیں گھروں میں وہ اپنے خاوندوں کو کہا کرتی تھیں: ہم آپ سے مال کی زیادتی کا مطالبہ نہیں کرتیں، ہاں! اتنا کہتی ہیں کہ ہمیں ہمیشہ حلال مال لا کر دینا۔

3 ارتکابِ معصیت

تیسری چیز جس سے کیفیات سلب ہوتی ہیں وہ ہے ارتکابِ معصیت۔ گناہ کا کرنا۔ سالک کو چاہیے کہ وہ گناہ سے بھی بچے۔

وساوس معصیت میں داخل نہیں:

اس سلسلے میں سالک ایک سوال اکثر پوچھتے ہیں: جی! وسوسے بڑے آتے ہیں۔ بھئی! وساوس تو غیر اختیاری چیز ہیں اور غیر اختیاری چیز پر پکڑ ہی نہیں ہوتی۔ اس لیے برے وسوسے کا آجانا برا نہیں ہے۔ ہاں! برے خیال کو سوچنا، دل میں لانا

اور دل میں جمانا برا ہے۔ تکلف کے ساتھ کسی گناہ کے منظر کے بارے میں یا کسی گناہ کے خیال کی بارے میں مت سوچیں۔ از خود اگر کوئی خیال آئے تو اس کو نظر انداز کر دیں۔ اس کی مثال یوں سمجھیں کہ آپ جب بازار میں جاتے ہیں تو کہیں سبزی بیچنے والے کی آواز، پھل بیچنے والے کی آواز، سوہن حلوہ بیچنے والے کی آواز، کپڑا بیچنے والے کی آواز، ریڑھی چلنے کی آواز، کسی کے چلنے کی آواز، کتنی ہی آوازیں آرہی ہوتی ہیں، تو کیا آپ ان آوازوں کو سن کر کھڑے ہو جاتے ہیں؟ نہیں، بلکہ چلتے چلے جاتے ہیں، اس کی طرف دھیان ہی نہیں دیتے۔ اس لیے کہ ہمیں ان سے کیا واسطہ؟ ہماری منزل تو بازار سے نکل کے اپنی جگہ پر پہنچنا ہے۔ یہ وساوس بھی اسی طرح ''بازار کا شور'' ہے۔ دھیان ہی نہ دیں، خیال آئے تو جھٹک دیں اور اپنی سوچ کو دوسری طرف لگا دیں۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ وساوس کی وجہ سے پریشان ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔

ایک دفعہ صحابہ رضی اللہ عنہم نے پوچھا: اے اللہ کے حبیب صلی اللہ علیہ وسلم! ہمیں بعض اوقات وسوسے آتے ہیں۔ نبی علیہ الصلوٰۃ والسلام نے پوچھا: وسوسے آتے ہیں تو دل خوش ہوتا ہے یا تنگ ہوتا ہے؟ عرض کیا اے اللہ کے حبیب صلی اللہ علیہ وسلم! دل بڑا تنگ ہوتا ہے۔ فرمایا:

((ذَاكَ صَرِيْحُ الْإِيْمَانِ)) (کنز العمال، رقم ۱۲۵۳)

''یہ تو عین ایمان ہے''

معصیت غیر اختیاری چیز کا نام نہیں ہے...... فرق سمجھیں ...... وساوس غیر اختیاری چیز ہیں، اس لیے وہ رکاوٹ نہیں بنتے۔ اور معصیت اختیاری چیز ہے؟ اس لیے وہ انسانی راستے میں رکاوٹ بن جاتی ہے۔

ترکِ معصیت اور مقامِ احسان:

اگر بندہ اللہ کے لیے معصیت کو چھوڑ دے تو یہ احسانی کیفیت حاصل ہونے کی

دلیل ہے۔ گویا کہ اس کو مقامِ احسان حاصل ہو گیا۔

اس کا آسان طریقہ یہ ہے کہ طلبا ہر وقت یہ آیت ذہن میں سوچتے رہیں:

﴿اَلَمْ یَعْلَمْ بِاَنَّ اللّٰہَ یَرٰی﴾

''کیا نہیں جانتے کہ اللہ دیکھتا ہے''

ہر وقت سوچتے رہیں کہ اللہ دیکھتا ہے...... اللہ دیکھتا ہے...... اللہ دیکھتا ہے۔ شروع میں تو یہ الفاظ ہی ہوں گے، لیکن بعد میں جب گناہ کرنے لگیں گے اور اس وقت بھی یہ الفاظ یاد تو آئیں گے، مگر نفس چونکہ مضبوط ہو گا لہٰذا گناہ پھر بھی ہو جائیں گے، مگر اس کی برکت یہ ہو گی کہ اس کے ساتھ ساتھ یہ کیفیت ایسا غلبہ پائے گی کہ بالآخر گناہوں سے جان چھوٹ جائے گی۔

اپنے آپ کو بے قصور نہ سمجھیں:

بسا اوقات انسان اپنے آپ کو بے قصور سمجھتا ہے۔ او جی! پتہ نہیں حالات ہی ایسے آ گئے، ویسے میں نے کوئی غلطی تو نہیں کی۔ ناں ناں ناں......!!! کبھی بھی اپنے آپ کو بے قصور نہ سمجھیں۔ ہمیشہ یہی سمجھیں کہ یقیناً مجھ سے کوتاہی ہوئی ہے۔

گناہ کیسے چھوڑیں؟

چند گناہ ایسے ہیں جن کو چھوڑنے کے لیے انسان کچھ ترکیب اختیار کر سکتا ہے۔

جھوٹ سے بچنے کا طریقہ:

مثلاً جھوٹ بولنا...... حدیثِ مبارکہ میں ہے:

''جو شخص جھوٹ بولتا ہے اس کے منہ سے ایسی بدبو نکلتی ہے کہ فرشتے اس سے ایک میل دور چلے جاتے ہیں''۔ (الترمذی، رقم الحدیث: ۱۸۹۵)

اب یہ بات حدیثِ پاک میں آئی ہے۔ اس کے بارے میں سوچیں کہ جب میں جھوٹ بولوں گا تو جیسے انسان کے جسم سے ریح نکلتی ہے تو بدبو ہوتی ہے جس سے عام لوگ بھی پریشان ہوتے ہیں تو جھوٹ بھی اس ریح کی مانند ہے۔ لیکن یہ منہ سے نکلتی ہے اور اس کی بدبو سے فرشتے دور چلے جاتے ہیں۔ جب بندہ جھوٹ بولے تو ہمیشہ سوچے کہ میرے منہ سے اب بدبو نکلی ہوگی اور میری اس بدبو پر فرشتے دور ہو گئے ہوں گے اور وہ میرے خلاف گواہی دیں گے۔ جب بار بار اس چیز کو سوچے گا تو پھر انسان کے لیے جھوٹ سے بچنا آسان ہو جائے گا۔

غصے سے بچنے کا طریقہ:

اگر ایک آدمی کو غصہ بہت آتا ہے تو وہ یہ سوچے کہ فلاں نے مجھے غصہ تو دلایا لیکن اگر اس غصے کو میں برداشت کرلوں گا تو یہ میرے گناہوں کا کفارہ بن جائے گا۔ اس کے برداشت کرنے پر معلوم نہیں میرے کون کون سے کبیرہ گناہوں کو معاف کر دیا جائے گا۔ اور یہ بندہ تو دھوبی کی مانند ہے، جیسے دھوبی کپڑے کو دھو دیتا ہے اسی طرح یہ مجھے دھو رہا ہے۔ تو جو غصہ دلا رہا ہوگا، اس پر بھی پھر غصہ نہیں آئے گا۔ غصہ برداشت کرنا بہت آسان ہے کہ بندہ سوچے کہ یہ دھوبی ہے، اللہ نے اسے میرے دھونے کے لیے دھوبی بنا دیا ہے۔

بدگمانی سے بچنے کا طریقہ:

اگر ایک انسان بدگمانی کا مرتکب ہوتا ہے تو وہ یہ سوچے: میں دوسروں کے متعلق تو میں جلدی رائے بنا لیتا ہوں، ذرا اپنے متعلق بھی تو سوچوں کہ میری اوقات کیا ہے؟ عجیب بات ہے کہ انسان دوسروں پر گناہ کا شک ہونے سے ان سے نفرت شروع کر

دیتا ہے جبکہ اپنے کبائر کا یقین ہوتا ہے پھر بھی اپنے نفس سے محبت کرتا ہے۔ یہ کتنی ناانصافی کی بات ہے؟ ہاتھوں سے گناہ کیا، اپنے آپ کو گناہ کرتے ہوئے آنکھوں سے دیکھا پھر بھی اپنے سے محبت ہے۔ اور دوسرے کے بارے میں ذرا سا شک بھی طبیعت میں آگیا تو اسی بنا پر اس سے نفرت کرنی شروع کر دی۔ تو بدگمانی سے بچنے کے لیے ہمیشہ یہ سوچے کہ دوسرے لوگ مجھ سے بہتر ہیں کہ مجھے ان کے گناہوں کا شک ہے اور اپنے گناہوں کا پک ہے۔ جب یہ سوچ دل میں رکھے گا تو دوسروں کے بارے میں دل سے بدگمانی ختم ہو جائے گی، پھر اسے اپنے ہی گناہ نظر آنے لگ جائیں گے۔ ایک گناہ نظر آتا ہے، پھر دوسرا نظر آتا ہے۔ یہ اللہ کی رحمت ہوتی ہے کہ اللہ تعالیٰ جس کسی بندے سے راضی ہوتے ہیں تو اس کے عیوب اس کے سامنے کھول دیتے ہیں۔ وہ پھر شہد کا چھتہ نظر آنے لگ جاتا ہے۔ شہد کا چھتہ کبھی دیکھا؟ ذرا اس کو چھیڑو تو سہی! جو مکھیاں ہوتی ہیں، ان کا ایک غول آتا ہے پھر دوسرا آتا ہے، پھر تیسرا آتا ہے۔ چلی آتی ہیں ایک کے بعد دوسری مکھیاں۔ تو جب اللہ کی رحمت متوجہ ہوتی ہے تو انسان کے گناہ شہد کے چھتے کی طرح کھلتے چلے جاتے ہیں۔

بدنظری سے بچنے کا طریقہ:

اگر ایک آدمی غیر محرم سے نظر کی حفاظت نہیں کر سکتا تو یہ سوچے کہ یہ جو اللہ تعالیٰ نے مجھے بینائی عطا کی ہے یہ اللہ کی دی ہوئی امانت ہے۔ اور حکم خدا ہے کہ

﴿اَنْ تُؤَدُّوا الْاَمٰنٰتِ اِلٰی اَهْلِهَا﴾ (النساء:۵۸)

''امانت کو اس کی صحیح جگہوں پر پہنچاؤ''

اب میں اگر غلط جگہ کو دیکھ رہا ہوں تو میں امانت میں خیانت کا مرتکب ہو رہا

ہوں، لہٰذا مجھے خیانت نہیں کرنی چاہیے، ورنہ مجھے اس بددیانتی کا جواب دینا پڑے گا۔

تکبر سے بچنے کا طریقہ:

عجب اور تکبر، ام الامراض ہیں۔ اکثر جو حسد ہوتا ہے وہ تکبر کی وجہ سے ہوتا ہے۔ اکثر جو دل کے اندر کینہ آتا ہے تکبر کی وجہ سے آتا ہے، بدگمانی آتی ہے تکبر کی وجہ سے آتی ہے۔ یہ تکبر اللہ کو اتنا ناپسند ہے کہ نبی علیہ الصلوٰۃ والسلام نے ارشاد فرمایا:

((لَا يَدْخُلُ الْجَنَّةَ مَنْ كَانَ فِيْ قَلْبِهٖ حَبَّةٌ مِّنَ الْكِبْرِ))

(کنز العمال، رقم: ۷۷۷۱)

''جس کے دل میں ذرہ کے برابر بھی تکبر ہوگا وہ جنت کے اندر داخل نہیں ہو سکے گا۔''

اگر کوئی بندہ کہے: جی! فلاں غلطی سے توبہ کرلو تو بعض لوگ جواب میں کہہ دیتے ہیں کہ نہیں میرے اندر تو کوئی ایسی بات نہیں ہے۔ یہ اصول یاد رکھیں کہ توبہ سے انکار کرنا ان گناہوں سے بڑا جرم ہوتا ہے۔ ایک تو گناہ کیے اور جب کسی نے ترغیب دی کہ بھئی توبہ کرلو تو توبہ سے انکار کرنا ان کیے ہوئے گناہوں سے بھی بڑا گناہ بن جاتا ہے۔ وجہ کیا ہے؟ وجہ یہ کہ نبی علیہ الصلوٰۃ والسلام نے ارشاد فرمایا:

((كُلُّ بَنِىْ اٰدَمَ خَطَّاءٌ وَ خَيْرُ الْخَطَّائِيْنَ التَّوَّابُوْنَ))

((شعب الایمان، رقم ۶۷۲۵))

تو اللہ کے حبیب صلی اللہ علیہ وسلم نے جب فرما دیا: (كُلُّ بَنِىْ اٰدَمَ خَطَّاءٌ) اب یہ بندہ جو کہتا ہے کہ نہیں جی! میں نے کوئی خطا نہیں کی تو یہ اللہ رب العزت کے محبوب صلی اللہ علیہ وسلم کی بات کو ٹھکرا رہا ہے۔ اور یہ بہت بڑا گناہ بن جاتا ہے۔

اکثر ہونے والا گناہ......غیبت:

اکثر ہم نے دیکھا کہ مجالس

......عورتوں کی ہوں تو بھی غیبت

......عوام الناس کی ہوں تو بھی غیبت

......حتی کہ طلبا، علما، سالکین کی ہوں تو بھی غیبت

کہیں نہ کہیں غیبت ہوتی ہے اور یہ غیبت کتنا بڑا جرم ہے! فرمایا:

((اَلْغِيْبَةُ اَشَدُّ مِنَ الزِّنَا))(شعب الایمان للبیہقی ،رقم: ۶۷۴۱)

''غیبت زنا سے بھی زیادہ سخت ہے''

غیبت زنا سے بھی زیادہ بڑا جرم ہے۔ کچھ باتوں کو تو ہم غیبت سمجھتے ہیں اور کچھ کو غیبت ہی نہیں سمجھتے۔ علامہ ابن عابدین شامی رحمۃ اللہ علیہ نے اس کی بڑی تفصیل لکھی ہے۔ وہ فرماتے ہیں کہ اگر کسی آدمی نے کسی کی تعریف کی اور دوسرے نے تعریف سن کر طنزاً کہا: ''ہاں! میں اسے جانتا ہوں'' یہ الفاظ بھی غیبت میں شامل ہیں۔ اور وہ فرماتے ہیں کہ جس طرح غیبت کا کرنا بڑا گناہ ہے اسی طرح کسی کے بارے میں غلط بات کا لکھنا بھی غیبت میں شامل ہوتا ہے۔

بدترین غیبت:

ایک عجیب بات لکھتے ہیں کہ اگر کوئی بندہ غیبت سے منع کرے اور یہ آگے سے کہے کہ جی ہم تو سچی بات کر رہے ہیں تو وہ فرماتے ہیں یہ بدترین غیبت ہوتی ہے۔ اکثر اس کا تجربہ ہوا ہوگا۔ محفل میں بات ہوئی۔ آپ کہیں گے: چھوڑ و یار! یہ غیبت ہے، وہ آگے سے کہے گا: جی میں تو سچ بات کر رہا ہوں۔ فرماتے ہیں: یہ بدترین غیبت ہے۔

اس لیے کہ یہ حرام کو حلال ثابت کر رہا ہے۔ بھئی! اگر جھوٹ ہوتا تو یہ بہتان ہوتا، غیبت بنی ہی اس لیے کہ وہ سچ بات تھی، مگر شریعت کہتی ہے کہ کسی کی پیٹھ پیچھے ایسی سچ بات کرنا کہ جو اس کو بری لگے، کڑوی لگے، یہ غیبت ہے۔ اس کو چھوڑ دو! تو اس لیے اگر کوئی غیبت سے منع کرے تو یہ کبھی نہ کہیں کہ جی ہم تو سچی بات کر رہے ہیں۔ یہ حرام کو حلال قرار دینا پہلے سے بھی بڑا گناہ ہوتا ہے۔

استغفار بھی لائقِ استغفار:

ہمارے بزرگ تو اپنے گناہوں پر استغفار کرتے تھے اور اس پر پھر روتے تھے، فرماتے تھے:

((اِسْتِغْفَارُنَا يَحْتَاجُ اِلَى اسْتِغْفَارٍ)) (التذکرہ للقرطبی: ۵۲/۱)

''ہمیں اپنے استغفار پر استغفار کرنے کی ضرورت ہے''

اس میں نکتہ یہ ہے کہ وہ سمجھتے تھے کہ ہمارا استغفار فقط زبانی ہے، دل میں ندامت کی کیفیت تو ہے نہیں، تو یہ تو استہزا ہو گیا۔ بھئی دیکھیں! ایک آدمی کسی کو جوتا مارے اور ساتھ ہی کہہ دے، یار معاف کر دو، تو اس کو معافی نہیں کہا جائے گا اس کو استہزا کہا جائے گا۔ اسی طرح اعضا سے انسان گناہ کرے، زبان سے معافی مانگ رہا ہو اور دل پُر از لطفِ گناہ (گناہ کے لطف سے بھر ہوا ہے) دل کی کیفیت اگر یہ ہے تو پھر یہ استغفار تو نہ ہوا یہ تو استہزا کرنا ہو گیا۔ اس لیے استغفار کرتے ہوئے، انسان دل کی ندامت کے ساتھ اللہ سے معافی مانگے۔

محاسبہ اور مراقبہ:

حضرت عمر رضی اللہ عنہ فرماتے تھے:

حَاسِبُوْا اَنْفُسَکُمْ قَبْلَ اَنْ تُحَاسَبُوْا ((الترمذی: رقم ۲۴۵۹))

''اپنا حساب کرلو اس سے پہلے کہ آپ کا حساب کیا جائے''

اسے محاسبہ کہتے ہیں۔ اسی طرح فرمایا گیا:

مُوْتُوْا قَبْلَ اَنْ تَمُوْتُوْا ((مرقاۃ المفاتیح، رقم: ۳۵۹/۱۵))

''مرنے سے پہلے مرجاؤ''

یہ محاسبہ اور مراقبہ انسان کا اللہ کی طرف رجوع کرنے کے لیے ایک بہترین عمل ہے۔ جتنا بھی گناہ گار اور خطا کار انسان ہو، اگر اس عمل کو اپنا لے تو آہستہ آہستہ گناہوں سے جان چھوٹ جاتی ہے اور نیکی کرنا آسان ہو جاتا ہے۔

طریقہ کار:

اس کا طریقہ یہ ہے کہ روزانہ رات کو سوتے ہوئے کچھ مسنون اعمال ہیں جو سونے سے پہلے کیے جاتے ہیں، ان کو کرنے کی عادت بنائے اور چند لمحے اپنا محاسبہ کرنے کی عادت بنائے۔ پھر انسان تھوڑی دیر کے لیے سوچ کہ...... ایک وقت آئے گا جب میری موت آئے گی...... اور جب موت آئے گی تو یہ گھر بھی چھوٹ جائے گا، بیوی بچے دوست احباب، کاروبار، کاریں بہاریں سب ختم ہو جائیں گی۔ اتنا سوچنے سے بھی اتنا احساس نہیں ہوگا...... پھر اگلی بات سوچ کہ اب جو مجھے نیک عمل کرنے کی توفیق ملی ہوئی ہے، موقع ملا ہوا ہے، یہ موقع مجھ سے چھین لیا جائے گا۔ پھر میں ایک دفعہ بھی سبحان اللہ نہیں کہہ سکوں گا، ایک دفعہ بھی کلمہ نہیں پڑھ سکوں گا۔ جب اس نظر سے سوچے گا تو پھر دل میں وقت کی قدر و قیمت کا احساس ہوگا...... اور پھر سوچے کہ مجھے موت آ گئی، اب رشتہ دار رو رہے ہیں، مجھے نہلایا جا رہا ہے، کفن دیا جا رہا ہے، جنازہ اٹھ کے جا رہا ہے، جنازہ پڑھنے کے بعد مجھے قبر میں اتارا جا رہا

ہے...... پھر سوچے کہ میں نے قبر کی تیاری تو کی نہیں۔ جب میں قبر میں جاؤں گا تو منکر نکیر میرے ساتھ کیا کریں گے؟ قبر کا عذاب کیسا ہوگا؟ اس کے بارے میں ذرا سوچے...... اور پھر یہ سوچے کہ قیامت کے دن مجھے اللہ رب العزت کے حضور پیش ہونا ہوگا۔ اور وہاں میرا نامۂ اعمال پیش ہوگا۔

﴿لَا یُغَادِرُ صَغِیْرَةً وَّ لَا کَبِیْرَةً اِلَّا اَحْصٰهَا﴾ (الکہف:۴۹)

''چھوٹا یا بڑا کوئی عمل ایسا نہیں جو اس میں پیش نہیں کیا جائے گا''

تو سوچیں کہ اس وقت تو میرے سارے کرتوت کھول دیے جائیں گے، پھر میرا کیا بنے گا؟ قیامت کے دن کی سختی، قیامت کے دن کی دہشت کو اپنے ذہن میں لائے اور قیامت کے دن کی ندامت کو اپنے ذہن میں لائے کہ اس وقت میرا نامۂ اعمال میری بیوی بھی دیکھے گی، میرے بچے بھی دیکھیں گے، میرے دوست بھی دیکھیں گے، میرے شاگرد بھی دیکھیں گے، انبیا بھی دیکھیں گے، اولیا بھی دیکھیں گے، پھر کیا ہوگا؟ تو جب یہ سوچے گا تو پھر دل میں ایک احساس پیدا ہوگا کہ مجھے اپنے نامۂ اعمال سے گناہوں کو مٹوانا ہے...... اور پھر سوچے کہ جہنم میں جب ڈالا جائے گا تو جہنمی پکاریں گے:

﴿قَالَ رَبِّ ارْجِعُوْنِ لَعَلِّیْ اَعْمَلُ صَالِحًا فِیْمَا تَرَكْتُ كَلَّا﴾

(المؤمنون:۴۹)

''اللہ واپس لوٹا دیجیے تا کہ میں جو چھوڑ آیا ہوں وہ نیک کام کیا کروں''

تو اللہ تعالیٰ ان کو تو کہیں گے کَلَّا ''ہرگز نہیں''...... یہ سوچے کہ اب میں اس کیفیت میں اب سو رہا ہوں کہ جیسے جہنم میں جانے کی حالت میں ہوں۔ رات کو سو جائے پھر جب صبح آنکھ کھلے تو دعا پڑھے:

((اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ الَّذِیْ اَحْیَانَا بَعْدَ مَا اَمَاتَنَا وَ اِلَیْہِ النُّشُوْرُ))

(بخاری، رقم: ۵۸۶)

ورساتھ یہ سوچے کہ رات میں نے اللہ سے مہلت جو مانگی تھی، مجھے اللہ نے ایک دن کی مہلت اور دے دی۔ لہٰذا آج کے دن مجھے گناہوں سے توبہ کرنی ہے، نیک عمل کرنے ہیں، اللہ کو راضی کر لینا ہے، میرے پاس یہ ایک دن ہے۔ اس کیفیت کے ساتھ وہ دن گزارے، پھر رات آئے گی، پھر مراقبہ کرے، پھر محاسبہ کرے اور پھر اگلے دن کو ایک مہلت کا دن سمجھے۔ جب زندگی کے ہر دن کو مہلت کا دن سمجھ کر گزارے گا تو اللہ تعالیٰ کبائر سے بندے کی حفاظت فرما دیں گے۔

اللہ کے در کے سوا کوئی در نہیں:

یہ اللہ رب العزت کا احسان ہے کہ اس نے نیک اعمال کی توفیق دے دی۔ وصول الی اللہ کے راستے پہ چلنے کی توفیق عطا فرما دی۔ اب ہمارے مسئلوں کا حل گناہوں کو چھوڑنا، اللہ کو راضی کرنا اور اللہ کی رحمتوں اور برکتوں کو حاصل کرنا ہے۔ ہم نے دیکھا ہے کہ پرائی بکری کو کوئی گھاس نہیں ڈالتا، بلکہ جو پالتو کتا ہوتا ہے پٹا ڈالنے کی وجہ سے اس کے گلے میں کالا سا نشان پڑ جاتا ہے۔ یہ کتا بھی اگر کسی کے دروازے پہ چلا جائے تو اسے کوئی کھانے پینے کو کچھ نہیں دیتا۔ ہر بندہ کہتا ہے: یہ تو پالتو کتا ہے، جائے اپنے مالک کے پاس۔ تو جس طرح پالتو جانور کو لوگ دھتکار دیتے ہیں کہ یہ جائے اپنے مالک کے پاس تو ہم لوگ جنہوں نے یہ وضع قطع اپنا لی ہم بھی اب پالتو بندے بن گئے، ہمارا خدا کے در کے سوا کوئی در نہیں۔ جتنا دنیا کی طرف بھاگیں گے دھتکارے جائیں گے، ہر کوئی کہے گا: جائے اپنے مالک کے در پر۔ اب ہمارے پاس اللہ کے در کے سوا کوئی آپشن نہیں ہے۔ آج اگر ہمیں عزتیں ملی ہیں تو

اللہ کے نام کی وجہ سے ملی ہیں۔ ہمارے حضرت فرماتے تھے:

وکانی ہاں تیڈے نام پچھوں نئیں تے کون کمینی نوں جاندا ہائی
میڈے گل پٹا تیڈے نام والا تیڈے نام نوں جگ سجاندا ہائی

اللہ! آپ کے نام کو دنیا پہچانتی تھی آپ کے نام کی نسبت سے ہمیں عزتیں ملیں۔

......طالب علم کو عزت ملی اللہ کے نام سے
......استاد کو عزت ملی اللہ کے نام سے
......سالک کو عزت ملی اللہ کے نام سے
......شیخ کو عزت ملی اللہ کے نام سے

تو جب اللہ ہی کے نام پر عزتیں ملی ہیں اور اللہ ہی کا دیا کھا رہے ہیں اور پل رہے ہیں تو اب اسی کے در کے اوپر ہمیں آنا ہے اور اپنے یار کو منانا ہے۔
اللہ تعالیٰ ہمیں نیکوکاری کی زندگی نصیب فرمائے۔ (آمین ثم آمین)

﴿وَ اٰخِرُ دَعْوٰنَا اَنِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ﴾

﴿وَقَالَ رَبُّکُمُ ادْعُوْنِیْ اَسْتَجِبْ لَکُمْ﴾
(المومن:٦٠)

دعاؤں کی قبولیت

بیان: محبوب العلماوالصلحا، زبدۃ السالکین، سراج العارفین
حضرت مولانا پیر ذوالفقار احمد نقشبندی مجددی دامت برکاتہم

تاریخ: 20 جنوری 2012ء بروز جمعہ، ٢٦ صفر ١٤٣٣ھ

موقع: بیان جمعۃ المبارک

مقام: جامع مسجد زینب معہد الفقیر الاسلامی جھنگ

اقتباس

آج دعاؤں کے رد ہونے کی وجہ یہ ہے کہ یا تو رزق ٹھیک نہیں ہوتا یا کوئی نہ کوئی گناہ ہوتا ہے، انسان محفل میں کرے یا تنہائی میں کرے، اس گناہ نے دعا کو باندھا ہوا ہوتا ہے۔ پرواز ہی نہیں کرنے دیتا۔ آپ ایک پرندے کو باندھ دیں۔ آپ کے پاس طوطا ہے اس کی ٹانگوں میں آپ ایک رسی باندھ دیں اور پھر کہیں کہ جی اڑتا نہیں، بھئی! اُڑے کیسے؟ پاؤں تو بندھے ہوئے ہیں۔ اسی طرح ہم دعاؤں کو گناہوں کی رسی سے باندھ دیتے ہیں، پھر کہتے ہیں کہ جی! دعا قبول نہیں ہوتی۔ بھئی! گناہ ظاہر میں ہوں یا چھپے ہوئے ہوں، یہ انسان کی دعاؤں کو قبول ہونے سے روک دیتے ہیں۔ انسان اگر نیکی کرے تو اللہ رب العزت یقیناً اس کی دعاؤں کو قبول فرمالیں گے۔

(حضرت مولانا پیر ذوالفقار احمد نقشبندی مجددی مدظلہ)

دعاؤں کی قبولیت

اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ وَکَفٰی وَسَلَامٌ عَلٰی عِبَادِہِ الَّذِیْنَ اصْطَفٰی اَمَّا بَعْدُ:
فَاَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنَ الشَّیْطٰنِ الرَّجِیْمِ ○ بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ ○
﴿وَقَالَ رَبُّکُمُ ادْعُوْنِیْ اَسْتَجِبْ لَکُمْ﴾
وَقَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ
((اَلدُّعَاءُ مُخُّ الْعِبَادَةِ)) (سنن الترمذی، رقم: ۳۲۹۳)
سُبْحَانَ رَبِّکَ رَبِّ الْعِزَّةِ عَمَّا یَصِفُوْنَ ○ وَسَلَامٌ عَلَی الْمُرْسَلِیْنَ ○
وَالْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ ○
اَللّٰھُمَّ صَلِّ عَلٰی سَیِّدِنَا مُحَمَّدٍ وَّعَلٰی اٰلِ سَیِّدِنَا مُحَمَّدٍ وَّبَارِکْ وَسَلِّمْ

پریشانیاں دور کرنے کا مؤثر سبب:

انسان کی زندگی میں صحت ، بیماری ، خوشی ، غمی ، کامیابی ، ناکامی مختلف قسم کے حالات آتے ہیں۔ جتنی پریشانی زیادہ ہوتی ہے، اسے دور کرنے کے لیے انسان اتنے ہی حیلے اختیار کرتا ہے۔ پریشانی کو دور کرنے کے لیے انسان جتنے اسباب اختیار کرسکتا ہے ان میں سب سے بہتر سبب دعا ہے۔ یعنی انسان اللہ رب العزت کی طرف متوجہ ہو پروردگار کے ہاتھ میں اس پوری کائنات کا نظام ہے۔

کوئی انسان بے غم نہیں:

بہت سارے لوگ پوچھتے رہتے ہیں کہ جی پریشانیاں ہیں، کیا کریں؟ بیٹے کی

طرف سے پریشانی، بیٹی کی طرف سے پریشانی، بیوی کی طرف سے پریشانی، کاروبار کی طرف سے پریشانی، کسی حاسد کی طرف سے پریشانی، تو یہ دنیا پریشانیوں کا گھر ہے۔

دریں دنیا کسے بے غم نہ باشد
گر باشد او بنی آدم نہ باشد

''اس دنیا میں کوئی بھی بے غم نہیں، اگر کوئی ہے تو وہ بنی آدم نہیں ہے۔''

جانور بے غم ہوسکتا ہے، جیسے بیل، گائے، بھینس۔ اگر انسان ہے تو اس کو غم ضرور ہوگا۔ یہ الگ بات ہے کہ بعض لوگوں کو دنیا کا غم ہوتا ہے، بعض لوگوں کو دین کا غم ہوتا ہے، غم ہر بندے کو ہوتا ہے، اس کے لیے بہترین علاج ''دعا'' ہے۔ نہ انسان حالات کو پیدا کرسکتا ہے نہ حالات کو دور کرسکتا ہے۔ ان کا آنا بھی اللہ کے اختیار میں ہے ان کا جانا بھی اللہ کے اختیار میں۔ تو دین اسلام نے ایک خوبصورت بات بتائی کہ ایسے معاملے میں تم اللہ کی طرف رجوع کرو۔

قبولیتِ دعا میں یقین شرط ہے:

لیکن دعا قبول ہونے کے لیے یقین شرط ہے کہ انسان دل میں یہ سوچے کہ اللہ کے سوا کوئی میری مراد کو پورا نہیں کرسکتا۔ یہ سو فیصد ٹھوس اور پکی بات ہے کہ جب تک دل میں یہ کیفیت نہیں ہوگی، دعا قبول نہیں ہوگی۔ حدیث قدسی ہے کہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

((اَنَا عِنْدَ ظَنِّ عَبْدِیْ بِیْ)) (صحیح البخاری، رقم:۶۸۵۶)

''میں بندے کے ساتھ اس کے گمان کے مطابق معاملہ کرتا ہوں''

گویا اللہ تعالیٰ یہ فرما رہے ہیں کہ اگر پکا یقین ہو کہ اللہ ہی پریشانیوں کو دور کردے گا تو میں کر دوں گا۔ اور اگر دعا مجھ سے مانگے اور ہاتھ مخلوق کے سامنے پھیلائے تو پھر میں دعاؤں کو قبول نہیں کروں گا۔

ایک بزرگ تھے۔ تہجد کے وقت اٹھے اور انہوں نے رو رو کر اللہ رب العزت سے دعا مانگی۔ ان کا بیٹا بھی تہجد میں اٹھا تھا، ساتھ ہی جاگ رہا تھا۔ جب انہوں نے رو کر دعا مانگی تو ایک آواز آئی: ؎

بریں در دعائے تو مقبول نیست

بخواری برو یا بزاری بایست

''اس در پر تمہاری دعا مقبول نہیں تم ذلت کے ساتھ جاؤ یا روتے ہوئے جاؤ۔''

زاری ہو یا خواری ہو، تم جو مرضی کرو تمہاری دعا قبول نہیں ہوگی۔ تو جب بیٹے نے یہ بات سنی تو اس نے کہا: ابو جان! آپ کو اتنا عرصہ ہوا تہجد میں دعا مانگتے ہوئے، اگر پیغام یہ ملا ہے تو پھر تہجد میں اٹھنے کا کیا فائدہ؟ تو والد نے جواب دیا: میرے بیٹے! مجھے زندگی میں اتنے سال تہجد پڑھتے گزر گئے، میں جب بھی اللہ سے رو رو کے مانگتا ہوں، آگے سے یہی آواز سنائی دیتی ہے مگر میرے بیٹے! یہ تو بتا کہ کوئی دوسرا در ہے کہ اسے چھوڑ کر میں وہاں چلا جاؤں؟ در بھی تو دوسرا کوئی نہیں۔ تو جیسے ہی یہ بات کہی، فوراً آواز آئی: ؎

قبول است اگرچہ ہنر نیست

کہ جز ما پناہے دگر نیست

''ہم نے قبول کر لی تمہاری دعا، اگر چہ اس میں خوبی کوئی نہیں کہ میرے سوا اور کوئی پناہ بھی نہیں ہے۔''

ہماری پناہگاہ تو فقط اللہ ہی کی ذات ہے۔ ؎

نہ کہیں جہاں میں اماں ملی، جو اماں ملی تو کہاں ملی
میرے جرمِ خانہ خراب کو، تیرے عفوِ بندہ نواز میں

ہمارے لیے ایک ہی در ہے کہ ہم اللہ رب العزت کے حضور اپنے آپ کو پوری طرح جھکا دیں۔

نسخۂ تسخیر:

شیخ الحدیث مولانا زکریا رحمۃ اللہ علیہ کے اوپر بہت زیادہ قرضہ ہو گیا تھا۔ ایک محفل میں حضرت مولانا الیاس رحمۃ اللہ علیہ، حضرت شیخ الحدیث رحمۃ اللہ علیہ اور حضرت مولانا حسین احمد مدنی رحمۃ اللہ علیہ موجود تھے۔ مولانا الیاس رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت مدنی رحمۃ اللہ علیہ سے فرمایا: میاں! زکریا پہ قرض بہت چڑھ گیا ہے، اللہ سے کہو کہ وہ قرض ادا کروا دیں۔ تو حضرت مدنی رحمۃ اللہ علیہ نے جواب میں فرمایا: اچھا! پھر مجھے کوئی تسخیر کا نسخہ ہی بتا دیں کہ میں جو کہوں اللہ مان لیں۔ تو مولانا الیاس رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا کہ نسخہ تو اللہ نے قرآن مجید میں بتا دیا:

﴿وَقَالَ رَبُّكُمُ ادْعُونِىٓ أَسْتَجِبْ لَكُمْ﴾ (غافر:۶۰)

''تم دعا کرو (یقین کے ساتھ) میں تمہاری دعاؤں کو قبول کروں گا''

اس سے بڑا نسخہ کیا ہو سکتا ہے؟ تو دعا کی قبولیت کے لیے دل کے اندر یہ یقین ہو کہ جو مانگ رہے ہیں، اللہ تعالیٰ قبول فرمائیں گے۔

قبولیتِ دعا کی تین صورتیں

ہاں! قبولیتِ دعا کی تین صورتیں حدیث پاک میں آئی ہیں۔

قبولیت کی پہلی صورت...... من وعن قبول:

کبھی تو انسان نے جو مانگا اللہ نے ویسے ہی پورا کر دیا، جس کو ہم سمجھتے ہیں کہ دعا قبول ہوئی ہے۔

دوسری صورت...... بہترین متبادل عطا:

کبھی انسان نے اللہ سے مانگا مگر وہ انسان کے لیے بہتر نہ تھا۔ تو اس کے بدلے اللہ نے کوئی بیماری دور کر دی، مصیبت دور کر دی، ذلت سے بچا لیا۔ یہ بھی قبولیت کی ایک صورت ہے یا یہ کہ اللہ رب العزت انسان کو اس سے بہتر چیز عطا فرما دیتے ہیں۔ اگرچہ وہ اس کی مصلحت کو نہیں سمجھ رہا ہوتا۔

اس کی مثال ایسے ہے کہ بچے نے آپ سے کہا کہ ابو! مجھے دس روپے دیں میں کوئی کھانے کی چیز خریدتا ہوں۔ آپ سوچتے ہیں کہ پتہ نہیں کیا الا بلا خریدے گا؟ آپ خود اس کو بازار لے جا کر بیس روپے کی چیز خرید کر دے دیتے ہیں کہ بیٹا! اچھی چیز کھاؤ۔

اور کئی مرتبہ انسان جو مانگتا ہے وہ اس کے حق میں اچھا نہیں ہوتا۔ مثال کے طور پر: انسان مال مانگتا ہے اور اللہ تعالیٰ جانتے ہیں کہ ظرف اتنا چھوٹا ہے کہ اگر تھوڑا سا مال بھی ملا تو یہ تکبر کے بول بولے گا، اس کا ایمان ضائع ہو جائے گا، اس لیے اللہ اس کو نہیں دیتے اور اس کے بدلے کوئی بلا اور مصیبت ٹال دیتے ہیں۔ آپ نے دیکھا ہوگا کہ ایکسیڈنٹ ہوتے ہوتے بچ گیا، او جی! اللہ نے بچا لیا، بھئی! پتہ نہیں کس دعا

کے بدلے اللہ نے اسے بچایا۔ آپ کا بچہ نیچے گرا، سر پہ چوٹ بھی آئی لیکن بچہ ٹھیک رہا، اللہ نے اس کی جان بچائی تو آخر کسی کی تو دعا تھی جو کام آئی۔

تیسری صورت......ذخیرۂ آخرت:

اور اگر ان میں سے کچھ بھی نہ ہو تو آخری بات: حدیث پاک میں آتا ہے، ہر دعا کو ذخیرہ بنا دیا جاتا ہے۔ قیامت کے دن اللہ تعالیٰ بندے کو بلائیں گے اور فرمائیں گے: میرے بندے! تو نے مجھ سے دعا مانگی اور میں نے دنیا میں تجھے کچھ نہ دیا کیونکہ وہ تیرے لیے بہتر نہیں تھا۔ میں آج تجھے بدلہ دیتا ہوں، اس بندے کو اللہ پاک اتنا بڑا اجر دیں گے کہ وہ حسرت کرے گا: اللہ! دنیا میں میری کوئی دعا بھی قبول نہ ہوتی، میری ہر دعا کا بدلہ مجھے یہاں دے دیا جاتا۔ (المستدرک للحاکم: ۱/۴۹۳)

دعا رد ہونے کی صورت:

ہاں! ایک صورت ہے، جس میں انسان کی دعا رد کر دی جاتی ہے اور اسے کچھ بھی نہیں ملتا۔ وہ یہ کہ جب انسان اپنی زبان سے کہنا شروع کر دیتا ہے کہ اللہ ہماری دعا نہیں سنتا، اللہ ہماری دعا قبول نہیں کرتا۔ تو جب زبان پہ یہ شکوہ آ جاتا ہے تو حدیث پاک میں آتا ہے کہ پھر اللہ اس کی دعا کو پھٹے کپڑے کی طرح اس کے منہ پہ مار دیتے ہیں۔ اس لیے کبھی بھی یہ نہیں کہنا چاہیے کہ دعا قبول نہیں ہوتی۔ دعا ضرور قبول ہوتی ہے۔ جب نبی علیہ السلام نے فرما دیا، سچے پیغمبر نے فرما دیا تو پھر اس میں شک کی گنجائش کہاں ہو سکتی ہے؟

''رب'' کے لفظ سے دعا مانگنے میں حکمت:

آپ قرآن مجید پڑھ کر دیکھ لیجیے! اکثر دعائیں ''رَبَّنَا'' یا ''رَبِّی'' کے لفظ سے

مانگی گئیں۔

﴿ رَبَّنَا ظَلَمْنَا اَنْفُسَنَا وَاِنْ لَّمْ تَغْفِرْ لَنَا وَتَرْحَمْنَا لَنَكُوْنَنَّ مِنَ الْخٰسِرِيْنَ﴾ (الاعراف:۲۳)

﴿رَبَّنَا هَبْ لَنَا مِنْ اَزْوَاجِنَا وَذُرِّيّٰتِنَا قُرَّةَ اَعْيُنٍ وَّاجْعَلْنَا لِلْمُتَّقِيْنَ اِمَامًا﴾ (الفرقان:۷۴)

﴿ رَبَّنَا اغْفِرْ لَنَا ذُنُوْبَنَا وَاِسْرَافَنَا فِيْٓ اَمْرِنَا وَثَبِّتْ اَقْدَامَنَا وانْصُرْنَا عَلَى الْقَوْمِ الْكٰفِرِيْنَ﴾ (آل عمران:۱۴۷)

رَبَّنَا کے لفظ سے کیوں مانگی گئیں؟ اس کی وجہ یہ ہے کہ ''رب'' وہ ذات ہے جو ہماری ضرورتوں کو پورا کرتی ہے، ہمیں رزق دیتی ہے اور ہمیں پال پوس کر نکتۂ کمال تک پہنچاتی ہے اور تربیت کرتی ہے۔ اس کو ''رب'' کہتے ہیں۔

اس کی مثال یوں سمجھیں کہ ایک بچے کی والدہ کا نام ہے فاطمہ۔ اب اس بچے کو جب کوئی تکلیف ہو تو وہ اپنی امی کو پکارے: فاطمہ! فاطمہ! تو ماں کا دل متوجہ نہیں ہوگا۔ لیکن اگر وہی بچہ اس تکلیف کے عالم میں کہے: امی! امی! تو امی کا لفظ کہنے سے اس کی ماں کتنا ہی مصروف کیوں نہ ہو، وہ سب کچھ چھوڑ چھاڑ کے آئے گی اور بچے کو آ کر اٹھا لے گی۔ اس لیے کہ امی کا مطلب ہے، وہ عورت جو اس بچے کی پرورش، نشوونما، اس کی ضروریات اور دیکھ بھال کرنے کی پابند ہے۔ تو امی کے لفظ میں عجیب مقناطیسیت ہے۔ اور اگر بچہ فاطمہ! فاطمہ! کہتا رہے تو ماں کی طبیعت متوجہ ہی نہیں ہوتی۔

رب کریم نے بھی یہی فرمایا کہ میرے بندو! تم مجھ سے مانگنا چاہتے ہو تو پھر رب کے نام سے مانگو جو تمہاری پرورش کرنے والا، ضرورتوں کو پورا کرنے والا ہے۔ جب اس طرح سے دعا مانگو گے تو میں پروردگار تمہاری ضرورتوں کو فوراً پورا کروں گا۔ اب

سوچیے کہ کتنے خوبصورت لفظ سے ہمیں دعا مانگنا سکھایا گیا۔ تو ہم جب بھی دعا مانگیں رب کے لفظ سے دعا مانگا کریں۔

اللہ کو اپنا ضبط نہ دکھائیں:

کئی لوگوں کو دیکھا کہ وہ دعا مانگتے ہوئے اللہ کو اپنی طاقت دکھاتے ہیں۔ مثلاً: ایک صاحب کہنے لگے: او جی! اللہ نے مجھے اتنا دیا ہوا ہے اور یہ بھی نہ دے تو پروا نہیں۔ اس کی بات سن کے مجھ پہ کپکپی طاری ہوئی، پھر میں نے اس کو کہا کہ حاجی صاحب! مہربانی فرمائیں اللہ کو اپنا ضبط نہ دکھائیں، اللہ کے سامنے طاقت نہ دکھائیں۔ پھر آپ کے ساتھ وہ ہوگا کہ دنیا تماشا دیکھے گی۔ تو یہ کہنا کہ یہ بھی اللہ نہ دیتا تو پروا نہیں تھی...... ناں جی ناں! اپنے آپ کو محتاج سمجھ کے مانگیں، اسی کو بندگی کہتے ہیں۔ انسان اپنے آپ کو اللہ کی ہر نعمت کا محتاج سمجھے، چھوٹی سے چھوٹی نعمت کا محتاج سمجھے۔

کئی نوجوانوں کو دیکھا: چند دفعہ دعا مانگی، قبولیت کے آثار ظاہر نہیں ہوئے تو اللہ سے ناراض ہو جاتے ہیں۔ او جی! میں تو دعا ہی نہیں مانگتا۔ چنانچہ ایک خاتون نے ٹیلی فون پر یہ کہا: جی! میں نے بڑی دعائیں مانگیں اُس کام کے لیے، اتنے سال مانگیں لیکن قبول نہیں ہوئیں، میں نے تو اب اللہ سے دعا مانگنی ہی چھوڑ دی ہے۔ میں نے سمجھایا کہ خاوند میں اور خدا میں فرق ہوتا ہے، تم خاوند کے ساتھ تو یہ رویہ کر سکتی ہو ناز نخرے کا، مگر اللہ تعالیٰ تو اللہ تعالیٰ ہیں، اپنی اوقات کو سمجھو! جب ذرا اس کے کان کھلے تو پھر اس کو احساس ہوا کہ اللہ سے ناراض ہونا، یہ آدابِ بندگی کو نہ سمجھنے کے مانند ہے۔ ہم بندے ہیں، ہمیں بندگی ہی سجتی ہے۔

مخلوق کی ایذا سے بچنے کے لیے دعا کیسے کریں؟

ہاں! کئی مرتبہ ایسا ہوتا ہے کہ لوگ اپنے بعض رشتہ داروں اور دوستوں کی طرف سے پریشان ہوتے ہیں۔ حدیث پاک میں فرمایا کہ اگر مخلوق کی طرف سے پریشان ہوں تو بھی انسان اللہ سے گناہوں کی معافی مانگے۔ یوں دعا مانگے کہ یا اللہ! یہ سب میرے اعمال کا نتیجہ ہے، میں حقیقتاً اس سے بھی زیادہ کا مستحق تھا، لیکن آپ مہربانی فرمائیں مجھے اس ایذا سے نجات عطا فرمائیں، یہ آپ کا مجھ پر احسان ہوگا۔ یوں دعا مانگیں کہ یہ جو ہو رہا ہے یہ میری اپنی بداعمالیوں کا نتیجہ ہے، حقیقت میں میں اس سے زیادہ کا مستحق تھا بس آپ مجھ پر مہربانی فرما دیں۔

ایک بزرگ کے اشعار ہیں: ؎

زندہ کنی عطائے تو
در بکشی فدائے تو
دل شدہ مبتلائے تو
ہر چہ کنی رضائے تو

”آپ مجھے زندہ کریں یہ آپ کی عطا ہے اور آپ مجھے اگر سولی چڑھا دیں تو میں آپ پہ فدا ہوں، اس لیے کہ میرا دل آپ کی محبت میں مبتلا ہے۔ جو آپ میرے ساتھ کریں گے محبوب میں آپ سے راضی ہوں۔“

یوں اپنے آپ کو اللہ تعالیٰ کے سامنے پیش کرے۔

اصل رکاوٹ ہمارے گناہ ہیں:

حضرت موسیٰ علیہ السلام کو قوم نے کہا کہ بارش نہیں ہو رہی، بارش کی دعا کیجیے! تو

حضرت موسیٰ علیہ السلام نے فوراً دعا مانگی۔

رَبَّنَا اغْفِرْلَنَا !......رَبَّنَا اغْفِرْلَنَا !......رَبَّنَا اغْفِرْلَنَا !

اے اللہ! مغفرت فرما دیجیے، مغفرت فرما دیجیے، مغفرت فرما دیجیے!

قوم نے کہا: عجیب بات ہے! ہم کہہ رہے ہیں کہ بارش کی دعا کر دیجیے اور آپ فرماتے ہیں: رَبَّنَا اغْفِرْلَنَا ۔تو حضرت موسیٰ علیہ السلام نے فرمایا: دیکھو! جب اللہ تعالیٰ کسی بندے سے راضی ہوتے ہیں تو گناہوں کو معاف کر دیتے ہیں اور ہر ضرورت کو پورا فر دیتے ہیں۔ دراصل رکاوٹیں تو ہمارے گناہ بنے ہوتے ہیں، اس لیے ہمیشہ اللہ رب العزت کی طرف متوجہ ہو کر عاجزی کے ساتھ دعا مانگیں۔

بددعا سے بچیں:

کوشش کریں کہ زبان سے بددعا کبھی بھی نہ نکلے۔ بعض لوگوں کو دیکھا کہ چھوٹی چھوٹی باتوں پہ بددعائیں دینے لگ جاتے ہیں۔ مثلاً مائیں اولاد کو بددعا دیتی ہیں، بہنیں بھائیوں کو بددعا دیتی ہیں، دوست دوست کو بددعا دیتا ہے۔ بددعا دینا یہ پسندیدہ چیز نہیں ہے، گو جائز ہے۔ نبی علیہ الصلوٰۃ والسلام ہمیشہ دعا دیتے تھے، اپنے ہوں یا غیر ہوں۔

بددعا دو انبیاء سے منقول ہے:

ہاں! قرآن مجید میں دو ایسے انبیا کا تذکرہ ہے کہ جن سے بددعا منقول ہے۔

(ا)......ایک حضرت موسیٰ علیہ السلام ہیں۔ جب قوم کے بچوں کو ذبح کیا گیا اور ان پر ظلم کی انتہا کر دی گئی تو انہوں نے دعا مانگی:

﴿رَبَّنَا اطْمِسْ عَلٰى اَمْوَالِهِمْ وَ اشْدُدْ عَلٰى قُلُوْبِهِمْ فَلَا يُؤْمِنُوْا حَتّٰى

يَرَوُا الْعَذَابَ الْاَلِيْمَ﴾ (یونس:۸۸)

''اے اللہ ان کے مال کو تباہ کر دے اور ان کے دلوں کو سخت کر دے تا کہ ایمان نہ لائیں حتی کہ دردناک عذاب دیکھ لیں''

(۲)......اور ایک حضرت نوح علیہ السلام نے بددعا کی۔ ایک ہزار سال کے قریب اپنی قوم کو دین کی طرف بلاتے رہے:

﴿قَالَ رَبِّ اِنِّیْ دَعَوْتُ قَوْمِیْ لَيْلًا وَّ نَهَارًا﴾ (نوح:۵)

''فرمایا: اے پروردگار! میں اپنی قوم کو دن اور رات بلاتا رہا''

اور قوم پتھر مارتی رہی، بالآخر انہوں نے بددعا مانگی:

﴿رَبِّ لَا تَذَرْ عَلَى الْاَرْضِ مِنَ الْكٰفِرِيْنَ دَيَّارًا﴾ (نوح:۲۶)

''اے میرے پروردگار! زمین پر کافروں میں سے کسی کو بستا نہ چھوڑ''

نبی علیہ الصلوٰۃ والسلام ہمیشہ دعا دیتے تھے:

اور ہمارے نبی علیہ الصلوٰۃ والسلام ہمیشہ دعا دیتے تھے۔ حتی کہ جب طائف کے سفر میں کفار نے اتنی ایذا پہنچائی اور فرشتے پوچھنے کے لیے آئے کہ جی آپ حکم دیں تو ہم دو پہاڑوں کو آپس میں ٹکرا کر بستی کو ہی ختم کر دیں، تو نبی علیہ السلام نے فرمایا کہ نہیں!

((اَللّٰهُمَّ اهْدِ قَوْمِیْ فَاِنَّهُمْ لَا يَعْلَمُوْنَ)) (جمع الجوامع، رقم:۲۴۶۲)

''اے اللہ! میری قوم کو ہدایت دے کہ وہ جانتے نہیں''

اللہ سے مانگتے رہیں:

انسان مانگتا رہے اللہ کے در سے۔ حضرت زکریا علیہ السلام اللہ رب العزت سے اولاد کی دعا مانگتے مانگتے بوڑھے ہو گئے۔ قرآن مجید نے اس پر گواہی دی۔ انہوں نے

یہ دعا مانگی:

﴿رَبِّ اِنِّیْ وَهَنَ الْعَظْمُ مِنِّیْ وَ اشْتَعَلَ الرَّاْسُ شَيْبًا﴾ (مریم:۴)

''اے پروردگار! میری ہڈیاں بوسیدہ ہو گئیں، اور سفیدی میرے بالوں میں پھیل گئی''

یعنی مانگتے مانگتے، میں اس عمر کو پہنچ گیا کہ بال سفید ہو گئے، ہڈیاں بوسیدہ ہو گئیں۔

﴿وَ لَمْ اَكُنْ بِدُعَآئِكَ رَبِّ شَقِيًّا﴾ (مریم:۴)

''اے اللہ! ابھی بھی میں آپ سے دعا مانگنے میں مایوس نہیں ہوں''

اس بڑھاپے میں بھی میں آپ سے امید کرتا ہوں کہ آپ مجھے اولادِ نرینہ عطا فرمائیں گے، پھر اللہ نے دعا قبول فرمالی۔

قبولیتِ دعا کے چند مواقع

حدیثِ مبارکہ میں کچھ اوقات بتائے گئے ہیں جن میں دعائیں جلدی قبول ہوتی ہیں۔

○ قرآن مجید کی مشغولیت:

مثال کے طور پر فرمایا: حدیث قدسی ہے:

((يَقُوْلُ الرَّبُّ تَبَارَكَ وَ تَعَالٰی: مَنْ شَغَلَهُ الْقُرْآنُ وَ ذِكْرِیْ عَنْ مَّسْأَلَتِیْ اَعْطَيْتُهُ اَفْضَلَ مَا اُعْطِی السَّآئِلِيْنَ)) (کنز العمال، رقم:۲۳۳۲)

اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتے ہیں کہ جو بندہ قرآن مجید کی تلاوت میں اتنا مصروف رہے کہ دعا مانگنے کا وقت ہی نہ ملے یا عبادت اور ذکر میں اتنا مصروف رہے کہ اس کو

دعا مانگنے کی فرصت نہ ملے۔ تو اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

اَعْطَيْتُهُ اَفْضَلَ مَا اُعْطِيَ السَّائِلِيْنَ

میں مانگنے والوں سے زیادہ بہتر اس بندے کو بدلہ اور اجر عطا فرما دیتا ہوں اس لیے کہ میری عبادت کی وجہ سے وہ مجھ سے مانگ نہ سکا، اب میں اس کی ضروریات کو پورا کرتا ہوں۔

○ اجتماعی دعا:

اکٹھے دعا مانگنا جلدی قبول ہونے کی نشانی ہے۔

حدیث مبارکہ میں ہے:

((لَا يَجْتَمِعُ مَلَأٌ فَيَدْعُوْ بَعْضُهُمْ وَ يُؤَمِّنُ الْبَعْضُ اِلَّا اَجَابَهُمُ اللّٰهُ))

(المستدرک للحاکم، رقم:۵۴۷۸)

مجمع جب دعا مانگتا ہے تو کچھ لوگ دعا مانگتے ہیں باقی اس پر آمین کہتے ہیں تو اللہ رب العزت اس مجمعے کی مانگی ہوئی دعا کو قبول فرما لیتے ہیں۔

حدیث پاک میں فرمایا:

((مَنْ كَانَتْ لَهٗ اِلَى اللّٰهِ حَاجَةٌ فَلْيَدْعُ بِهَا دُبُرَ صَلَاةٍ مَّفْرُوْضَةٍ))

(کنز العمال، رقم:۳۳۸۹)

''جس بندے کو اللہ سے کوئی حاجت ہو، اس کو چاہیے کہ ہر فرض نماز کے بعد اللہ سے دعا مانگے۔''

اس میں قبولیت کی بشارت دی گئی ہے۔

○ دوست کی دعا دوست کے پیچھے:

پھر دوست کی دعا دوست کی پیٹھ پیچھے بھی جلدی قبول ہوتی ہے۔ حدیث مبارکہ

میں آتا ہے:

((دُعَاءُ الْمَرْءِ الْمُسْلِمِ مُسْتَجَابٌ لِّاَخِيْهِ بِظَهْرِ الْغَيْبِ))

(کنز العمال، رقم: ۳۳۱۰)

''مومن کی دعا مومن دوست کی پیٹھ پیچھے اللہ رب العزت قبول کرتے ہیں''

کیوں کہ وہ پیٹھ پیچھے دعا اخلاص کی وجہ سے کر رہا ہوتا ہے اور اخلاص اللہ کو پسند ہے۔

○ ہر چیز اللہ سے مانگیں:

تو ہم اللہ تعالیٰ سے مانگنا سیکھیں۔

حدیث پاک میں فرمایا:

((سَلُوْا اللّٰهَ حَوَائِجَكُمْ حَتَّى الْمِلْحِ)) (کنز العمال، رقم: ۳۱۴۱)

''تم اللہ سے اپنی حاجتیں طلب کرو، حتیٰ کہ تم نمک بھی اللہ سے مانگو۔''

یعنی گھر میں نمک کم ہو گیا تو فرمایا کہ نمک بھی اللہ سے مانگو۔

○ تہجد کا وقت:

رات کو تہجد کا وقت ایسا ہوتا ہے کہ جب دعائیں جلدی قبول ہوتی ہیں۔ بخاری شریف کی روایت ہے، نبی علیہ الصلوٰۃ والسلام نے ارشاد فرمایا:

((يَنْزِلُ رَبُّنَا تَبَارَكَ وَ تَعَالٰى كُلَّ لَيْلَةٍ اِلَى السَّمَاءِ الدُّنْيَا حِيْنَ يَبْقٰى ثُلُثُ اللَّيْلِ الْاٰخِرُ))

''رات کا جب آخری تیسرا حصہ رہ جاتا ہے یعنی دو حصے رات گزر گئی اور تیسرا حصہ باقی رہ گیا، اس وقت آسمانِ دنیا پہ اللہ تبارک وتعالیٰ نزول فرماتے ہیں''

آگے فرمایا:

((فَيَقُوْلُ مَنْ يَّدْعُوْنِيْ فَأَسْتَجِيْبَ لَهٗ مَنْ يَّسْأَلُنِيْ فَأُعْطِيَهٗ مَنْ يَّسْتَغْفِرُنِيْ فَأَغْفِرَ لَهٗ)) (صحیح البخاری، رقم:۱۱۴۵)

اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں: ہے کوئی دعا کرنے والا! جس کی دعا کو میں قبول کروں۔ ہے کوئی مانگنے والا؟ جس کو عطا کروں۔ ہے کوئی مغفرت چاہنے والا؟ کہ میں اس کے گناہوں کی مغفرت کروں۔"

تو اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ اس وقت کی مانگی ہوئی دعاؤں کو قبول فرماتے ہیں۔

قبولیتِ دعا کی شرط......نیکوکاری اور پرہیزگاری:

مگر ہر بندے کی دعا قبول نہیں ہوتی۔ اس میں شرائط ہیں۔ مثال کے طور پر: جو نیکوکار ہوگا، پرہیزگار ہوگا، اللہ اس کی دعا کو رد نہیں فرمائیں گے۔ حدیث پاک میں ہے۔

((رُبَّ اَشْعَثَ مَدْفُوْعٍ بِالْاَبْوَابِ لَوْ اَقْسَمَ عَلَى اللّٰهِ لَاَبَرَّهٗ))

(صحیح مسلم، رقم:۴۷۵۴)

"کتنے پراگندہ حال، دروازوں پر دھتکارے جانے والے بندے ایسے ہوتے ہیں کہ اگر وہ قسم کھا کر کوئی بات کر دیں تو اللہ اس کی قسم کو ضرور پورا کر کے دکھادے گا"

مگر یہ وہ بندے ہیں جو نیکی تقویٰ کی زندگی گزارنے والے ہیں۔

اور اگر نیکی تقوای نہ ہو اور انسان حرام کاموں میں مبتلا ہو، حرام رزق کھاتا ہو، پھر دعا قبول نہیں ہوتی۔ چنانچہ مسلم شریف کی روایت ہے:

((ثُمَّ ذَكَرَ الرَّجُلَ يُطِيلُ السَّفَرَ اَشْعَثَ اَغْبَرَ يَمُدُّ يَدَيْهِ اِلَى السَّمَآءِ فَيَقُوْلُ يَارَبِّ! يَارَبِّ! وَ مَطْعَمُهٗ حَرَامٌ وَ مَشْرَبُهٗ حَرَامٌ وَ مَلْبَسُهٗ حَرَامٌ وَ غُذِّيَ بِالْحَرَامِ فَاَنّٰى يُسْتَجَابُ لِذٰلِكَ))

(صحیح مسلم، رقم:۱۶۸۶)

''نبی علیہ السلام نے ایک بندے کا تذکرہ کیا جو لمبا سفر کر کے آیا۔ پراگندہ حال اور غبار آلود فرمایا کہ وہ ہاتھ پھیلاتا ہے اللہ کے سامنے اور کہتا ہے یارب! یارب! مگر اس کا کھانا حرام کا، اس کا پینا حرام کا، اس کا لباس حرام کا، حرام کی غذا اس کو ملی تو اس کی دعا کو کیسے قبول کیا جائے گا؟''

تو معلوم ہوا کہ دعاؤں کی قبولیت کے لیے رزقِ حلال کا ہونا بنیادی شرط ہے۔ دیکھیں! ایک بندہ پراگندہ حال، غبار آلود چہرے والا، جب ہاتھ اٹھاتا ہے تو اللہ اس کے بارے میں فرماتے ہیں: اگر یہ قسم اُٹھا کے بات کرے تو میں اس کی قسم کو پورا کر دوں گا۔ جبکہ ادھر ایک مسافر بھی ہے، حالانکہ مسافر کی دعائیں قبول ہوتی ہیں، مگر اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں چونکہ اس کی غذا حرام، رزق حرام، لہٰذا اس بندے کی دعا کو قبول نہیں کیا جائے گا۔

قبولیتِ دعا کا اکسیر نسخہ:

دعا کی قبولیت کا ایک آسان نسخہ...... حدیث مبارکہ ہے:

((مَنِ اسْتَغْفَرَ لِلْمُؤْمِنِيْنَ وَ الْمُؤْمِنَاتِ كُلَّ يَوْمٍ سَبْعًا وَّ عِشْرِيْنَ مَرَّةً))

''جو بندہ ہر دن میں ایمان والے مردوں اور عورتوں کے لیے ستائیس مرتبہ استغفار کرے۔''

ستائیس مرتبہ یہ پڑھے:

((اَللّٰھُمَّ اغْفِرْلِیْ وَلِلْمُؤْمِنِیْنَ وَ الْمُؤْمِنَاتِ))

اس میں ان کے لیے استغفار ہے۔فرمایا:

كَانَ مِنَ الَّذِیْنَ یُسْتَجَابُ لَھُمْ وَ یُرْزَقُ بِھِمْ اَھْلُ الْاَرْضِ

''یہ وہ بندہ ہے کہ اس کی دعا کو قبول کرلیا جائے گا اور جس کی وجہ سے زمین والوں کو رزق دیا جائے گا۔''(کنزالعمال،رقم:۲۰۶۸)

اب یہ کتنا آسان نسخہ ہے! ہم اس کو فجر کے بعد بھی پڑھ لیا کریں، مغرب کے بعد بھی پڑھ لیا کریں۔

اَللّٰھُمَّ اغْفِرْلِیْ وَلِلْمُؤْمِنِیْنَ وَ الْمُؤْمِنَاتِ

اللہ رب العزت فرماتے ہیں کہ دعائیں بھی قبول ہوں گی اور اس کو تو رزق دیں گے ہی اس کی وجہ سے پھر ہم باقیوں کو بھی رزق عطا فرما دیں گے۔

مستجاب الدعوات کی تین صفات

ایک حدیث مبارکہ میں ہے:

اَلَا تُحِبُّ اَنْ تَكُوْنَ مِمَّنْ یَّقُوْلُ یَارَبِّ یَا رَبِّ

''کیا تم ان بندوں میں سے ہونا چاہتے ہو جو کہتے ہیں: اے رب! اے رب!

قَالَ اللّٰهُ لَبَّیْكَ یَا عَبْدِیْ سَلْ تُعْطَ

''تو اللہ تعالیٰ اس کے جواب میں فرماتے ہیں: اے میرے بندے! بتاؤ میں حاضر ہوں، مانگو کہ تمہیں عطا کیا جائے۔''

(۱) فَاَطِبْ مَطْعَمَكَ یُجَبْ دَعْوَتُكَ

''اگر ایسا بننا چاہتے ہو تو اپنے کھانے کو پاکیزہ کر لو، تمہای دعا کو قبول کر لیا جائے گا۔''

جو رزق رشوت سے، سود سے، جھوٹ کی کمائی سے، غیر شرعی کام کی کمائی سے پاک ہو اس کو رزق حلال کہتے ہیں۔ چنانچہ فرمایا کہ تم رزق حلال اختیار کرو۔ یہ دعاؤں کی قبولیت کا ذریعہ ہے۔

(۲) وَ انْتَصِفُ لِلنَّاسِ مِنْ نَّفْسِكَ

''اور اپنے معاملات جو بندوں کے ساتھ ہیں ان میں انصاف کا معاملہ کرو۔''

ہم لوگوں سے تو اچھائی چاہتے ہیں مگر خود اچھائی نہیں دیتے۔ یہ تو انصاف کا معاملہ نہیں ہے۔ جو خود لینا چاہتے ہیں، وہ دوسروں کو دیں بھی سہی۔

(۳) وَ خَالِقِ النَّاسَ بِخُلُقٍ حَسَنٍ

اور لوگوں کے ساتھ اچھے اخلاق کے ساتھ پیش آؤ۔

محبت کے ساتھ، پیار کے ساتھ، ہمدردی کے ساتھ پیش آؤ! جب تم اپنے اخلاق کو ایسا کر لو گے تو اللہ تعالیٰ تمہاری دعاؤں کو رد کرنا چھوڑ دیں گے۔

یہاں قبولیتِ دعا کے لیے تین چیزیں بتائیں، پہلی بات کہ رزقِ حلال کا اہتمام کریں، دوسری بات کہ ہم اپنے معاملات کو ٹھیک کریں اور تیسری بات، کہ دوسرے سے حسنِ اخلاق سے پیش آئیں۔

اللہ والے بن جاؤ:

ایک اور جگہ علما نے لکھا ہے:

كُنْ رَبَّانِيًّا فَإِنَّكَ إِذَا قُلْتَ :يَا رَبِّ! قَالَ اللّٰهُ: لَبَّيْكَ عَبْدِيْ! سَلْ

تُعْطَ

''تم اللہ والے بن جاؤ، اس لیے کہ جب تم کہو گے: یا اللہ! تو اللہ فرمائیں گے: میرے بندے! مانگو جو مانگو گے تمہیں دے دیا جائے گا''

تو وہ فرماتے ہیں اس کے لیے دو شرطیں ہیں:

طَاعَةُ اللّٰهِ فِي الْقَوْلِ وَ الْفِعْلِ

قول میں اور فعل میں اللہ کی اطاعت ہو۔

اور دوسرا

فِيْ السِّرِّ وَالْعَلَانِيَةِ

''لوگوں کے سامنے بھی انسان نیکی کرے اور تنہائی میں بھی نیکی کرے۔''

جب یہ دو کام ہو گئے تو اللہ تعالیٰ دعاؤں کو رد نہیں کریں گے۔

دعا قبول نہ ہونے کی وجہ:

آج دعاؤں کے رد ہونے کی وجہ یہ ہے کہ یا تو رزق ٹھیک نہیں ہوتا یا کوئی نہ کوئی گناہ ہوتا ہے، انسان محفل میں کرے یا تنہائی میں کرے، اس گناہ نے دعا کو باندھا ہوا ہوتا ہے۔ پرواز ہی نہیں کرنے دیتا۔ آپ ایک پرندے کو باندھ دیں۔ آپ کے پاس طوطا ہے اس کی ٹانگوں میں آپ ایک رسی باندھ دیں اور پھر کہیں کہ جی اڑتا نہیں، بھئی! اُڑے کیسے؟ پاؤں تو بندھے ہوئے ہیں۔ اسی طرح ہم دعاؤں کو گناہوں کی رسی سے باندھ دیتے ہیں، پھر کہتے ہیں کہ جی! دعا قبول نہیں ہوتی۔ بھئی! گناہ ظاہر میں ہوں یا چھپے ہوئے ہوں، یہ انسان کی دعاؤں کو قبول ہونے سے روک دیتے ہیں۔ انسان اگر نیکی کرے تو اللہ رب العزت یقیناً اس کی دعاؤں کو قبول فرمالیں گے۔

اس لیے قرآن مجید میں اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿قُلْ مَا يَعْبَؤُا بِكُمْ رَبِّيْ لَوْلَا دُعَاؤُكُمْ﴾ (الفرقان:۷۷)

''آپ کہہ دیجیے! کہ میرا رب تمہاری ذرا بھی پروانہ کرے گا، اگر تم عبادت نہ کرو گے۔''

اب ہم کہیں کہ

......جی ہم تو صوفی ہیں، توقع رکھیں کہ دعا قبول ہونی چاہیے، اگرچہ گناہ بھی کریں۔

......ہم تو جی دین کے طالب علم ہیں، گناہ بھی کریں اور توقع رکھیں کہ دعا قبول ہونی چاہیے۔

......ہم حاجی صاحب ہیں، گناہ بھی نہ چھوڑیں اور توقع رکھیں کہ دعا قبول ہوگی۔

فرمایا: دعا قبول نہیں ہوگی، اللہ تعالیٰ کا بندوں کے ساتھ جو رشتہ ہے وہ نیکی اور پرہیزگاری کی وجہ سے ہے۔ جو نیکوکار اور پرہیزگار ہے وہ اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں مقبول ہے اور جو گناہوں میں پڑے گا، وہ اللہ سے دور ہوگا۔

چاہے تم بڑے سید خاندان کے فرد ہو، بڑے باپ کے بیٹے ہو، چاہے تمہیں بڑا لقب مل گیا۔ فرمایا: نہیں! اللہ بالکل تمہاری پروانہیں کرے گا جب تک کہ تم عبادت نہ کرو گے۔ عبادت کرو گے تو اللہ کے ہاں دعائیں قبول ہوں گی۔ دعائیں قبول نہ ہونے کی ایک وجہ ہمارے گناہ ہیں۔ ہم گناہوں کو چھوڑ دیں تو اللہ رب العزت ہماری دعاؤں کو قبول فرمالیں گے۔ یہ جو نعمتوں سے محرومی ہوتی ہے، اس کی بنیادی وجہ کہیں نہ کہیں نعمت کی ناقدری یا گناہوں پہ جرأت ہوا کرتی ہے۔

ابتلا میں پڑنے کی ایک قرآنی مثال:

چنانچہ قرآن مجید نے ایک واقعہ بتایا کہ ایک بہت نیک انسان تھے۔ ان کے

باغات تھے، جب ان کو باغات کی آمدنی ملتی تھی، وہ مساکین کو بلاتے تھے، یتیموں کو بلاتے تھے اور ان پر بھی خوب خرچ کرتے تھے اور بقیہ اپنے گھر بھی خوب لے کے جاتے تھے۔ اس کے باپ کی وفات ہوگئی۔ بچے غفلت کی زندگی گزارنے والے تھے۔ اب جب فصل پک کر تیار ہوگئی تو بچوں نے آپس میں بیٹھ کر مشورہ کیا کہ ہمارا والد تو بہت سادہ طبیعت کا بندہ تھا، وہ تو ایسے ہی پیسہ دوسروں پہ لٹا دیتا تھا، ہم اس مرتبہ ساری فصل گھر لائیں گے۔ ہم خود کھائیں گے اور اپنے آپ پر لگائیں گے۔ چنانچہ انہوں نے کہا کہ جس دن ہم نے فصل کاٹنے کے لیے جانا ہے، ہم نے کسی کو خبر ہی نہیں ہونے دینی، کوئی وہاں پہنچے ہی نہیں۔ انہوں نے بات کو چھپایا، وہ سمجھے کہ بس رزق ہے، اٹھا کے لے آنا ہے، مسئلہ ہی کوئی نہیں۔ جب دل مال پر جمے ہوئے تھے، طبیعتیں اللہ سے غفلت میں تھیں تو پھر اللہ نے بھی ان پر آزمائش بھیج دی۔

چنانچہ صبح صبح اٹھے اور ایک دوسرے کو کہا کہ جلدی کرو بھئی جلدی کرو! ہم فصل لانے کے لیے پہنچیں۔ اللہ فرماتے ہیں کہ ہم نے اپنا عذاب اس سے پہلے بھیج دیا۔ کوئی بیماری یا کوئی ایسا معاملہ ہوا کہ ان کی ساری فصل ہی ختم ہوگئی۔ جب یہ وہاں پہنچے تو جگہ کو دیکھ کر کہنے لگے کہ ہم تو راستہ بھول کر آگئے ہیں، یہ تو ہماری جگہ نہیں ہے۔ پھر جب حالات اور قرائن کو دیکھا تو پتہ چلا کہ جگہ تو ہماری ہی ہے لیکن کوئی ایسا معاملہ پیش آیا کہ فصل ساری ختم ہوگئی۔ اب آپس میں باتیں کرنے لگے:

﴿قَالَ اَوْسَطُهُمْ اَلَمْ اَقُلْ لَّكُمْ لَوْلَا تُسَبِّحُوْنَ ○ قَالُوْا سُبْحٰنَ رَبِّنَآ اِنَّا كُنَّا ظٰلِمِيْنَ ○ فَاَقْبَلَ بَعْضُهُمْ عَلٰى بَعْضٍ يَّتَلَاوَمُوْنَ ○ قَالُوْا يٰوَيْلَنَآ اِنَّا كُنَّا طٰغِيْنَ ○﴾ (القلم: ۲۸ تا ۳۱)

جو ان میں درمیانہ بھائی تھا۔ وہ بھی انہی کے ساتھ تھا مگر تھوڑی بہت اس میں

خیر تھی۔ کہنے گا: میں نے تمہیں نہیں کہا تھا کہ تم اللہ کی پاکی بیان کرو، کبریائی بیان کرو! اللہ تعالیٰ تمہیں رزق دیتا ہے اور تم غافل تھے۔ یہ سن کے ان کو محسوس ہوا کہ واقعی ہم تو بہت غافل ہو گئے۔ کہنے لگے: ہمارا پروردگار پاک ہے ہم ہی ظلم کرنے والے ہیں۔

﴿عَسٰی رَبُّنَا اَنْ یُّبْدِلَنَا خَیْرًا مِّنْهَاۤ اِنَّاۤ اِلٰی رَبِّنَا رٰغِبُوْنَ﴾ (القلم:۳۲)

''ہم امید کرتے ہیں کہ اللہ ہمیں اس سے بہتر عطا کر دے، ہم اپنے اللہ کی طرف رغبت کرتے ہیں، رجوع کر لیتے ہیں''

اللہ فرماتے ہیں:

﴿کَذٰلِكَ الْعَذَابُ وَلَعَذَابُ الْاٰخِرَةِ اَکْبَرُ لَوْ کَانُوْا یَعْلَمُوْنَ﴾ (القلم:۳۳)

''ایسے عذاب ہوتا ہے اور آخرت کا عذاب تو اس سے بھی بڑا ہوتا ہے''

جو گناہوں میں پڑتا ہے، اللہ فرماتے ہیں: پھر ہم اس کا یہ انجام کرتے ہیں۔

اس آیت میں مکہ والوں کو پیغام دیا کہ تم نعمتوں کی جو ناقدری کر رہے ہو اور میرے محبوب صلی اللہ علیہ وسلم کی مخالفت پہ ڈٹے ہوئے ہو، ہم نے تم سے پہلے والوں کے ساتھ بھی یہ کیا، تم اگر یوں کرو گے تو تمہیں بھی اپنی پکڑ میں لیں گے۔ دنیا میں بھی تمہیں اسی طرح ذلت ملے گی

﴿وَلَعَذَابُ الْاٰخِرَةِ اَکْبَرُ﴾

''اور آخرت کا عذاب تو بہت بڑا ہے''

ہم کیوں گناہوں کے پیچھے بھاگتے ہیں؟ ہمیں چاہیے کہ ہم سچی توبہ کریں، گناہ کرنے کے لیے جتنا دوڑیں گے، عذاب اس سے تیز ہو کر ہماری طرف آئے گا اور ہمیں پکڑ لے گا۔ عذاب سے اور پریشانی سے بچ نہیں سکتے۔ اس کا ایک ہی طریقہ

ہے کہ ہم اللہ رب العزت سے اپنے گناہوں کی معافی مانگیں اور اللہ کی حمد و ثنا بیان کریں، اللہ تعالیٰ کی تسبیح بیان کریں۔

مصیبت سے نکلنے کی قرآنی مثال:

قرآن مجید میں ایک مثال اور بھی ہے کہ حضرت یونس علیہ السلام اللہ کے ایک پیغمبر تھے۔ ایک امتحان میں پھنس گئے، مچھلی نے ان کو نگل لیا۔ اب ذرا سوچیے کہ پانی کا اندھیرا، پھر مچھلی کے پیٹ کا اندھیرا، گویا اندھیروں پر اندھیرے۔ اس مچھلی کے پیٹ میں انہوں نے اللہ سے دعا مانگی:

﴿لَا اِلٰهَ اِلَّا اَنْتَ سُبْحَانَكَ اِنِّیْ كُنْتُ مِنَ الظّٰلِمِیْنَ﴾ (الانبیا:۸۷)

''اے اللہ! نہیں کوئی معبود سوائے تیرے، تو پاک ہے اللہ! میں ظلم کرنے والا ہوں''

میں گناہگار ہوں، میں خطا کار ہوں۔ کتنی خوبصورت دعا مانگی کہ پہلے اللہ کے سوا ہر معبود کے ہونے کی نفی کی۔ کہ تو ہی ہے معبودِ حقیقی اور محبوبِ حقیقی۔ یہ کلمہ اللہ کی رحمت کو متوجہ کرتا ہے۔ جیسے ہی یہ کہا: ﴿لَا اِلٰهَ اِلَّا اَنْتَ﴾ تو ساتھ ہی کہا: اللہ! میرا تو تیرے سوا ہے ہی کوئی نہیں۔ تو رحمت متوجہ ہو گئی اور پھر کہا: ﴿سُبْحَانَكَ﴾ ''اللہ! تو پاک ہے'' تو بہت عظیم ہے۔ اس طرح دینے والے کا دل اور زیادہ متوجہ ہوا۔ اور پھر کیا کہا: ﴿اِنِّیْ كُنْتُ مِنَ الظّٰلِمِیْنَ﴾ ''میرا ہی تو گناہ ہے اور میری ہی تو خطا ہے''۔ جب غیر کی نفی بھی کر لی، اللہ کی عظمت بھی بیان کر لی اور اپنے گناہوں سے معافی بھی مانگ لی تو اللہ نے پھر مہربانی فرمائی کہ مچھلی کے پیٹ سے انہیں باہر نکال دیا۔ ان کو اللہ نے پھر وہی زندگی عطا فرما دی۔

پریشانیوں کے پیٹ سے نکلنے کا نسخہ:

مفسرین نے لکھا ہے کہ کئی مرتبہ انسان کے حالات اس کے لیے مچھلی کا پیٹ بن جاتے ہیں۔ مثلاً کاروبار ہے، بڑھتا ہی نہیں، نقصان پہ نقصان، نقصان پہ نقصان، مچھلی کا پیٹ بن گیا...... نکل ہی نہیں پا رہے۔ بیٹی کی شادی کی، ایسے لوگوں میں پھنس گئے جو بے قدرے نکلے...... مچھلی کا پیٹ بن گیا...... نکل ہی نہیں سکتے۔ انسان کے اپنے دفتر کے حالات ایسے بن جاتے ہیں، کئی الجھنیں بن جاتی ہی...... یہ بھی مچھلی کا پیٹ۔ تو فرمایا کہ تم بھی اپنی زندگی میں مچھلی کے پیٹ میں جا سکتے ہو۔ مگر تمہارا بچنے کا پھر ایک ہی راستہ ہے کہ تم اللہ کے سامنے گناہوں کی معافی مانگو۔ اللہ کی عظمت کو بیان کرو، دل سے کہو:

﴿لَا اِلٰهَ اِلَّا اَنْتَ سُبْحَانَكَ اِنِّیْ كُنْتُ مِنَ الظّٰلِمِیْنَ﴾

اللہ تعالیٰ قرآن مجید میں فرماتے ہیں:

﴿فَلَوْلَا اَنَّهٗ كَانَ مِنَ الْمُسَبِّحِیْنَ o لَلَبِثَ فِیْ بَطْنِهٖۤ اِلٰی یَوْمِ یُبْعَثُوْنَ﴾ (الصافات: ۱۴۳۔۱۴۴)

''اگر یونس ہماری تسبیح بیان نہ کرتے تو ہم قیامت تک ان کو مچھلی کے پیٹ کے اندر ہی بند رکھتے''

تو ہم اگر اللہ کی حمد بیان نہیں کریں گے تو موت تک ان مچھلیوں کے پیٹوں میں بند رہیں گے۔ ان مچھلیوں کے پیٹوں سے نکلنے کا ایک ہی طریقہ ہے وہ یہ کہ اللہ کی عظمت بیان کریں اور اللہ سے اس یقین سے دعائیں مانگیں کہ اے اللہ! آپ ہی یہ کام پورا فرمائیں گے۔

نبی علیہ الصلوٰۃ والسلام کی عاجزانہ دعائیں

میدانِ بدر کی دعا:

نبی علیہ الصلوٰۃ والسلام نے بدر کی رات دعا مانگی:

((اَللّٰھُمَّ!اِنْ تُھْلِكْ ھٰذِهِ الْعِصَابَةَ مِنْ اَھْلِ الْاِسْلَامِ لَا تُعْبَدْ فِي الْاَرْضِ))(صحیح مسلم:۳۳۰۹)

''اے اللہ! یہ مٹھی بھر لوگ ہیں جو میرے ساتھ ہیں، اگر یہ ہلاک ہو گئے تو زمین پر (قیامت تک) آپ کی عبادت کرنے والا کوئی نہیں ہوگا۔''

اس پر محدثین نے تفصیل لکھی ہے کہ نبی علیہ الصلوٰۃ والسلام نے یہ بات کیسے فرمادی؟ تو انہوں نے فرمایا: اس لیے کہ نبی علیہ السلام نے اپنے آپ کو اس جماعت میں شامل کر کے بات کی۔ یہ تھوڑے سے تو لوگ ہیں، اپنے آپ کو ان میں شامل کیا۔ اگر یہ ختم ہو گئے تو پھر قیامت تک آپ کی کون عبادت کرے گا؟ تو بات تو سچ تھی۔ سبحان اللہ! یہ دعا مانگی اور سیدنا صدیق اکبر رضی اللہ عنہ خیمے کے باہر دعا سن رہے تھے۔ جب نبی علیہ الصلوٰۃ والسلام نے دعا مانگی تو سیدنا صدیق اکبر رضی اللہ عنہ خیمے کے اندر گئے اور عرض کیا: اے اللہ کے حبیب صلی اللہ علیہ وسلم! بس کر دیجیے! اب اللہ کی مدد اتر کر رہے گی۔ یہ ہوتی ہے دعا کہ سننے والے کا دل گواہی دے کہ اس دعا کو رد نہیں کیا جا سکتا۔ انسان دعا مانگے تو ایسے یقین کے ساتھ اور اتنی عاجزی کے ساتھ دعا مانگے۔

طائف کے سفر کی دعا:

نبی علیہ الصلوٰۃ والسلام کی دو دعائیں سن لیجیے! آپ کتنی عاجزی سے دعا مانگتے ہیں۔ طائف کے سفر سے واپسی پر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے دعا مانگی:

اَللّٰھُمَّ اِلَیْكَ اَشْكُوْ ضُعْفَ قُوَّتِیْ وَ قِلَّةَ حِیْلَتِیْ وَ ھَوَانِیْ عَلَی النَّاسِ

اے اللہ! میں اپنی قوت کی کمی کا اور حیلے کی قلت کا اور ہلکے پن کی شکایت میں آپ کے سامنے ہی کرتا ہوں۔

اَرْحَمَ الرّٰحِمِیْنَ! اَنْتَ اَرْحَمُ الرّٰحِمِیْنَ، اَنْتَ رَبُّ الْمُسْتَضْعَفِیْنَ

اے رحم کرنے والوں میں سے سب سے زیادہ رحم کرنے والے! آپ ہی تو ارحم الراحمین ہیں۔ آپ ہی تو کمزوروں کے پروردگار ہیں میرے بھی پروردگار آپ ہیں۔

اِلٰی مَنْ تَكِلُنِیْ اِلٰی عَدُوٍّ بَعِیْدٍ یَتَجَھَّمُنِیْ

''اللہ! آپ مجھے کس کے حوالے کرتے ہیں؟ ایسے دور رہنے والے دشمن کے حوالے کہ جو میرے اوپر سختی کرتا ہے۔''

اَمْ اِلٰی صَدِیْقٍ قَرِیْبٍ كَلَّفْتَهٗ اَمْرِیْ

''یا آپ نے میرے قریبی دوست کو میرے معاملے کا مالک بنا دیا۔''

اِنْ لَّمْ تَكُنْ غَضْبَانًا عَلَیَّ فَلَا اُبَالِیْ

''اللہ! اگر آپ مجھ سے ناراض نہیں ہیں تو مجھے کوئی پروا نہیں۔''

غَیْرَ اَنَّ عَافِیَتَكَ اَوْسَعُ لِیْ

''لیکن آپ کی عافیت میرے لیے زیادہ وسعت رکھتی ہے۔''

اَعُوْذُ بِنُوْرِ وَجْھِكَ الَّذِیْ اَشْرَقَتْ لَهُ الظُّلُمٰتُ

''اے اللہ! میں آپ کے چہرے کے اُس نور کے طفیل مانگتا ہوں جس سے سب ظلمتیں روشن ہو گئیں۔''

وَ صَلُحَ عَلَيْهِ اَمْرُ الدُّنْيَا وَالْاٰخِرَةِ

اور جس سے دنیا اور آخرت کے سارے کام سنور گئے۔

اَنْ يَنْزِلَ بِیْ غَضَبُكَ اَوْ يَحُلَّ بِیْ سَخَطُكَ

''میں پناہ مانگتا ہوں کہ آپ کا غضب مجھ پر ہو، یا آپ کا غصہ میرے اوپر جائز ہو۔''

لَكَ الْعُتْبٰى حَتّٰى تَرْضٰى

اے اللہ! آپ کو اس وقت تک منانا ضروری ہے، جب تک کہ آپ راضی نہیں ہو جاتے۔

وَلَا حَوْلَ وَلَا قُوَّةَ اِلَّا بِكَ (مرقاۃ:۱۶۰۔۱۶۱)

کیا خوبصورت دعا مانگی!

ایک اور عجیب دعا:

نبی علیہ الصلوٰۃ والسلام نے ایک اور دعا مانگی، دیکھیے!

اَللّٰهُمَّ اِنِّیْ عَبْدُكَ

''اے اللہ! میں آپ کا بندہ ہوں۔''

وَ ابْنُ عَبْدِكَ وَابْنُ اَمَتِكَ

''آپ کے بندے کا بیٹا ہوں اور آپ کی بندی کا بیٹا ہوں۔''

یہ واسطے کیوں دیے جا رہے ہیں؟ بتانا یہ چاہ رہے ہیں کہ اللہ! میرے باپ بھی کلمہ گو تھے اور آپ کے در پہ جھکا کرتے تھے، میری ماں بھی کلمہ گو تھی اور مصلے پہ آپ کے سامنے دامن پھیلاتی تھی۔ اے اللہ! میں آپ کا نسلی غلام ہوں۔ میرے ماں باپ بھی آپ کے در کے سائل تھے، آپ کے در کے منگتے تھے۔ اللہ! میں ان کا بچہ، ان کا

بیٹا ہوں۔ میں بھی ان کی طرح آپ کے در کا منگتا ہوں۔ اور اے اللہ! جو نسلی خادم ہوتے ہیں، ان کا دنیا دار بھی لحاظ کر لیتے ہیں کہ یہ ہمارے نسلی غلام ہیں۔ سبحان اللہ۔ اللہ کے حبیب ﷺ نے کیا خوبصورت بات کہی! عاجزی کی انتہا دکھا دی۔ آگے فرمایا:

نَاصِيَتِيْ بِيَدِكَ مَاضٍ فِيَّ حُكْمُكَ عَدْلٌ فِيَّ قَضَاؤُكَ

اللہ! میری پیشانی آپ کے قبضے میں ہے۔ میرے بارے میں تیرا حکم صادر ہو چکا، اللہ تیری تقدیر کا باب میرے بارے میں جو بھی ہے وہ حق ہے۔

اَسْئَلُكَ بِكُلِّ اسْمٍ هُوَ لَكَ سَمَّيْتَ بِهٖ نَفْسَكَ

''اللہ! میں تیرے ہر نام کے صدقے تجھ سے دعا مانگتا ہوں، جس نام کو آپ نے اپنے لیے پسند کیا۔''

اَوْ عَلَّمْتَهٗ اَحَدًا مِّنْ خَلْقِكَ ، اَوْ اَنْزَلْتَهٗ فِيْ كِتَابِكَ اَوِ اسْتَأْثَرْتَ بِهٖ فِيْ عِلْمِ الْغَيْبِ عِنْدَكَ

یا مخلوق میں سے کسی ایک کو اپنا نام بتایا۔ یا جس کو اپنے کسی کتاب میں نازل کیا اور آپ نے کسی کو وہ نام نہیں بتایا آپ جانتے ہیں۔

اے اللہ! میں آپ کے اس نام کی برکت سے بھی آپ سے دعا مانگتا ہوں۔

اَنْ تَجْعَلَ الْقُرْآنَ رَبِيْعَ قَلْبِيْ وَ نُوْرَ صَدْرِيْ وَ جَلَاءَ حُزْنِيْ وَ ذَهَابَ هَمِّيْ (مسند احمد، رقم: ۴۳۱۸)

اللہ کے حبیب ﷺ نے امت کو کیا خوبصورت دعائیں بتائی ہیں۔ اللہ رب العزت ہمیں بھی مستجاب الدعوات بندوں میں شامل فرمائے، پریشانیوں سے محفوظ فرمائے اور اللہ تعالیٰ کے حبیب ﷺ نے جو مانگا ہمیں بھی عطا فرمائے۔

﴿وَ اٰخِرُ دَعْوَانَا اَنِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ﴾

﴿وَاِذۡ يَرۡفَعُ اِبۡرٰهٖمُ الۡقَوَاعِدَ مِنَ الۡبَيۡتِ وَاِسۡمٰعِيۡلُ رَبَّنَا تَقَبَّلۡ مِنَّا اِنَّكَ اَنۡتَ السَّمِيۡعُ الۡعَلِيۡمُ﴾ (البقرة:۱۲۷)

تعمیر مسجد کی اہمیت

بیان: محبوب العلماوالصلحا، زبدۃ السالکین، سراج العارفین
حضرت مولانا پیر ذوالفقار احمد نقشبندی مجددی دامت برکاتہم
تاریخ: 29 مارچ 2012ء بروز جمعرات، ۶ جمادی الاول ۱۴۳۳ھ
موقع ومقام: افتتاح مرکزِ سکون نزد موٹروے ٹول پلازہ راولپنڈی

اقتباس

مسجد کی تعمیر عام گھروں کی نسبت بہتر ہونی چاہیے۔ اگر لوگوں کے گھر کچے ہوں تو ہم مسجد پکی اینٹوں کی بنائیں۔ اللہ کا گھر ہے، خوبصورت ہونا چاہیے۔ اگر لوگوں کے گھر پکی اینٹوں کے ہوں تو ہم مسجد کے اندر پلاسٹر لگائیں۔ اور اگر گھر پلاسٹر کے بنیں ہیں تو پھر ہم مسجد کے اندر ماربل بھی لگائیں، چپس بھی لگوائیں۔ اور اگر گھر بھی محلات کی طرح بنے ہوئے ہیں۔ تو پھر یہ تو شہنشاہِ حقیقی کا گھر ہے اس کو اس سے بھی بہتر اور اونچا بناؤ، قرآن مجید میں اس بات کا حکم ہے:

﴿فِیْ بُیُوْتٍ اَذِنَ اللّٰهُ اَنْ تُرْفَعَ﴾ (النور:۳۶)

''یہ گھر ہیں جن کو اونچا بنانے کا اللہ نے حکم فرمایا''

(حضرت مولانا پیر ذوالفقار احمد نقشبندی مجددی مدظلہ)

تعمیر مسجد کی اہمیت

اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ وَكَفٰى وَسَلَامٌ عَلٰى عِبَادِهِ الَّذِيْنَ اصْطَفٰى اَمَّا بَعْدُ:
فَاَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطٰنِ الرَّجِيْمِ○ بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ○
﴿وَإِذْ يَرْفَعُ إِبْرَاهِيمُ الْقَوَاعِدَ مِنَ الْبَيْتِ وَإِسْمَاعِيلُ رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنَّا إِنَّكَ أَنتَ السَّمِيعُ الْعَلِيمُ﴾ (البقرة:۱۲۷)
سُبْحَانَ رَبِّكَ رَبِّ الْعِزَّةِ عَمَّا يَصِفُوْنَ○ وَسَلَامٌ عَلَى الْمُرْسَلِيْنَ○
وَالْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ○
اَللّٰهُمَّ صَلِّ عَلٰى سَيِّدِنَا مُحَمَّدٍ وَّعَلٰى اٰلِ سَيِّدِنَا مُحَمَّدٍ وَّبَارِكْ وَسَلِّمْ

مسجد کی ابتدا کا وقت...... یادگار وقت:

قرآن مجید فرقانِ حمید میں اللہ رب العزت نے بیت اللہ کی تعمیر کا نقشہ کھینچا ہے۔ جس جگہ ہم آج یہاں اکٹھے ہوئے ہیں اس جگہ ایک مسجد بنے گی، اسی مناسبت سے عاجز نے یہ آیت تلاوت کی ہے۔ مسجد کی تعمیر کا وقت قبولیتِ دعا کا وقت ہوتا ہے، یادر کھنے کا وقت ہوتا ہے۔ اس لیے ارشاد فرمایا:

﴿وَإِذْ يَرْفَعُ إِبْرَاهِيمُ الْقَوَاعِدَ مِنَ الْبَيْتِ وَإِسْمَاعِيلُ﴾

''اور یاد کرو اس وقت کو جب ابراہیم علیہ السلام اور اسمٰعیل علیہ السلام میرے گھر کی بنیادوں کو اٹھا رہے تھے''

تو معلوم ہوا جو مسجد بننے کا وقت ہوتا ہے وہ یادگار وقت ہوتا ہے۔ ورنہ تو اندازِ کلام مختلف بھی ہوسکتا تھا۔

آیتِ کریمہ کے تین سبق

اس آیت مبارکہ میں ہمارے لیے بہت سے سبق موجود ہیں۔

(۱) کام کی نسبت بڑوں کی طرف ہی کرنی چاہیے:

پہلا سبق تو یہ کہ کام کرنے والے ابراھیم علیہ السلام تو تھے ہی مگر اسمٰعیل علیہ السلام بھی ساتھ تھے۔ دستور یہ ہے کہ جوان بوڑھوں کی نسبت زیادہ کام کرتے ہیں، چونکہ ان کے جسم میں طاقت ہوتی ہے، مگر ربِ کریم نے اس آیت میں ابراہیم علیہ السلام کا تذکرہ پہلے کیا۔ چنانچہ قیامت تک یہ دستور رہے گا کہ کسی بھی جگہ پر کوئی ادارہ یا مسجد بنانے میں کچھ لوگ شامل ہوں، خواہ اس میں بچے شامل ہوں، جوان یا بوڑھے، کریڈٹ ہمیشہ بوڑھوں کو دیا جائے گا۔ اگرچہ کام جوان زیادہ کریں گے، مگر وہ اللہ کی رضا کے لیے کریں گے تو اجر پائیں گے۔ تذکرہ جب بھی ہوگا بڑوں کا ہوگا۔

اسی لیے آپ دیکھ لیں، جہاں یہ بحث چل پڑے کہ نوجوان کہیں کہ کام ہم زیادہ کرتے ہیں، لہٰذا کمیٹی کا صدر ہم نے بننا ہے تو برکت ہی اٹھ جاتی ہے۔ اس لیے کہ وہ قرآنی ترتیب کے خلاف کر رہے ہوتے ہیں۔ قرآنی ترتیب تو یہ ہے کہ جس جگہ چھوٹے بڑے مل کر حصہ لے رہے ہوں، ہمیشہ فضیلت بڑوں کو دی جائے گی۔ جو کام ان کی دعاؤں سے ہوسکتا ہے وہ نوجوانوں کی محنتوں سے نہیں ہوسکتا۔ اس لیے کہتے ہیں کہ اللہ دن دگنی رات چوگنی ترقی نصیب فرمائے۔ عقل کہتی ہے: رات کو تو کام بند ہوتا ہے، مزدور چھٹی کر جاتے ہیں اور کام بھی کریں تو رات کی شفٹ میں تو کام پورا نہیں ہوتا، دن کی شفٹ میں زیادہ ہوتا ہے، مگر یہاں کہا گیا دن دگنی رات چوگنی...... یہ بات کیوں؟ تو علما نے اس کا جواب دیا کہ چونکہ انسان دن میں محنت کرتا ہے تو

محنت کے اوپر اگر دگنی برکت آتی ہے تو رات کو جب اللہ کے سامنے دامن پھیلا کر دعائیں مانگتا ہے تو اللہ کی مدد شامل ہوتی ہے اور ترقی کی رفتار چار گنا ہو جاتی ہے، لہٰذا اگرچہ چھوٹے بڑے مل کر حصہ لیتے ہیں، مگر بڑوں کی دعائیں اللہ کے ہاں بڑی قدر والی ہوتی ہیں۔

(۲) غیر ضروری تفصیلات سے گریز:

اس آیت میں اللہ کا گھر بنانے کا ذکر کیا، لیکن کوئی تفصیل نہیں بتائی کہ میرا گھر بن رہا تھا، کس جگہ پر تھا؟ کتنا سائز تھا؟ غیر ضروری تفصیلات کو چھوڑ دیا، مطلب کی بات کی، کام سے کام رکھا۔ اس میں ہمارے لیے سبق ہے۔ ہم اپنی بات چیت میں کئی دفعہ چھوٹی چیزوں کو بہت بڑا بنا کر پیش کر دیتے ہیں، ایسی تفصیلات میں چلے جاتے ہیں جن کی ضرورت نہیں ہوتی۔ مقاصد اور مطالب کی طرف نظر نہیں ہوتی۔ اس چیز سے احتراز کرنا چاہیے۔

(۳) عمل کا مدار قبولیت پر ہے:

تو اتنی بات کر کے کہ ''یاد کرو اس وقت کو جب میرے ابراہیم علیہ السلام اور اسماعیل علیہ السلام میرے گھر کی بنیادیں اٹھا رہے تھے''۔ فرمایا کہ اس وقت وہ یہ کہہ رہے تھے:

﴿رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنَّا﴾ اللہ اس کو ہماری طرف سے قبول فرمالیجیے۔ یہاں ایک نکتہ سمجھا دیا کہ تم کام چھوٹا کرو یا بڑا کرو، معمولی نوعیت کا کرو یا قیمتی نوعیت کا، اگر اللہ نے اس کو قبول نہ کیا تو تمہاری محنتیں کس کام کی۔ اس لیے مسجد بناتے ہوئے غیر ضروری باتوں کی طرف دھیان مت دو۔ اللہ سے قبولیت مانگو: اللہ! اس جگہ سے مقبول بندوں کی جماعت کو کھڑا کر دیجیے۔ اس جگہ سے علم کے نور کو پھیلا دیجیے۔ یہ قبولیت اللہ سے مانگنی ہوتی ہے۔

اہمیت کی حامل دعائیں

اب ایک بندہ کام بھی کر رہا ہے۔اور وہ غم سے بھرا ہوا ہے اور دعائیں کر رہا ہے کہ اللہ! بس قبول کر لے، بس قبول کر لے، تو ایسے بندے کی دعا اللہ کے ہاں قبول ہوتی ہے۔ دنیا کا دستور ہے کہ جب مزدور مزدوری کرتا ہے تو اسے اجرت ملتی ہے۔ اللہ کے ہاں بھی یہی دستور ہے۔ جب ابراہیم علیہ السلام اور اسمٰعیل علیہ السلام نے بیت اللہ کو بنایا تو ربِ کریم نے ان کو انعام دیا۔ بیت اللہ کے بنانے پر قبولیت تو وہ پہلے ہی مانگ رہے تھے، چنانچہ اس وقت انہوں نے چند دعائیں مانگیں جو بڑی اہمیت کی حامل ہیں۔

(۱) دعا میں اپنے آپ کو شامل کرنا:

پہلی دعا انہوں نے یہ مانگی:

﴿رَبَّنَا وَ اجْعَلْنَا مُسْلِمَيْنِ لَكَ﴾

''اے پروردگار! ہمیں مسلمان بنا''

باپ اور بیٹا یہ دو حضرات بنانے والے تھے، لہٰذا دعا مانگتے ہوئے تثنیہ کا صیغہ استعمال کیا۔اے اللہ! ہم (دونوں) کو پکا مسلمان بنا دیجیے۔ معلوم ہوا کہ دعا میں اپنے آپ کو پہلے شامل کرنا چاہیے۔ مسجد بنانے والے یہ تو چاہتے ہیں کہ سب آنے والے نیک بنیں، لیکن اپنے آپ کو بھول جاتے ہیں۔ چراغ تلے اندھیرا ہوتا ہے، اپنے آپ کو شامل نہیں کرتے۔ جبکہ سنت نبوی ﷺ یہی ہے کہ ایسے خیر کے کام میں اپنے آپ کو شامل کیا جائے۔ لوگ نیک بنیں تو کیا ہمارے لیے نیک بننا ضروری نہیں ہے؟ مصلح بننا بہت اچھی بات ہے مگر صالح بھی تو بنیں۔ تو بات اپنے سے شروع

ہوتی ہے۔اس لیے نبی علیہ الصلوٰۃ والسلام نے بدر کے میدان میں، کفار کی جماعت کو دیکھ کر دعا مانگی تھی: اے اللہ!

((اَللّٰھُمَّ اِنْ تُھْلِكْ ھٰذِہِ الْعِصَابَةَ مِنْ اَھْلِ الْاِسْلَامِ لَا تُعْبَدْ فِی الْاَرْضِ)) (صحیح مسلم، رقم: ۳۳۰۹)

''اے اللہ! اگر آج یہ صحابہ کی جماعت ہلاک کر دی گئی تو قیامت تک تیری عبادت نہیں کی جائیگی''

اے اللہ! میں یہ مٹھی بھر لوگوں کی جماعت تیرے راستے میں لے کر نکل آیا ہوں، اگر یہ لوگ آج ہلاک کر دیے گئے تو پھر قیامت تک تیری عبادت کرنے والا کوئی نہ رہے گا۔اس پر علما نے تفصیل لکھی ہے کہ اس کا کیا مطلب کہ اگر ۳۱۳ آدمی شہید ہو جاتے تو پھر قیامت تک اللہ تعالیٰ کا نام لینے والا کوئی نہ ہوتا۔تو اس کا جواب یہ دیا گیا کہ جب نبی علیہ السلام دعا کر رہے تھے تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے آپ کو اس جماعت میں شامل کر کے بات کی تھی۔اور واقعی اگر بشمول نبی علیہ الصلوٰۃ والسلام سب شہید ہو جاتے تو قیامت تک اللہ کا نام لینے والا کوئی دنیا میں نہ ہوتا۔

تو یہاں سے مزاج نبوی کا پتہ چلا کہ خیر کے کاموں میں صرف لوگوں کو نہیں کہنا ہوتا، خود بھی شامل ہونا ہوتا ہے۔اس لیے ہمارے مشائخ جب مساجد بناتے تھے تو لوگ بھی اس میں حصہ لیتے تھے اور وہ خود اپنا حصہ بھی ڈالتے تھے۔بعض بزرگوں کی عورتوں نے زیورات بیچے اور بنیاد وہاں سے شروع کی۔

نبی علیہ الصلوٰۃ والسلام نے یہ دعا مانگی تو اس دعا کو اپنی ذات سے شروع کیا کہ اللہ ہم دونوں کو پکا مسلمان بنا دیجیے۔ہم ذرا غور کریں کہ کیا ہم نے کبھی یہ دعا مانگی۔ہم تو اگر دعا بھی مانگتے ہیں تو دنیا کی کہ اللہ! بیٹے کو نوکری مل جائے، بیٹی کو اچھا رشتہ مل جائے۔

بیوی کے لیے گھر تعمیر ہو جائے، گاڑی مل جائے، نوکری اچھی ہو جائے، دنیا کے کاموں کی دعا مانگتے ہیں۔ اور اگر نیک بننے کی دعا مانگیں تو یہی دعا نکلتی ہے کہ اے اللہ! ہماری اولاد کو نیک بنا دے، جبکہ اپنی نیکی کے لیے اس سے پہلے دعا مانگنے کی ضرورت ہے۔ تو آج ہم اس کو ایک پوائنٹ بنائیں کہ ہم نے جب دعا کرنی ہے تو اپنے آپ سے اس کی ابتدا کرنی ہے کہ ہم نیک بنیں۔

(۲) دعا میں اقارب کو شامل کرنا:

پھر آگے ابراہیم علیہ السلام نے اپنے لیے دعا مانگ کر کام ختم نہیں کیا۔ اپنے عزیز و اقارب کے لیے بھی دعا کی:

﴿وَمِنْ ذُرِّيَّتِنَا أُمَّةً مُّسْلِمَةً لَّكَ﴾

''اے اللہ! اگر آپ (مسلمان جماعت) بنا دیجیے''

تو اپنے لیے بھی دعا مانگی، آنے والی نسلوں کے لیے بھی دعا مانگی۔ یہ بڑوں کی دعائیں ہوتی ہیں جو مسجدوں کے اندر دین کی محنت جاری و ساری ہو جاتی ہے۔ علما نے لکھا ہے کہ جس بندے کا اخلاص اللہ تعالیٰ کے ہاں قبول ہوتا ہے، اللہ تعالیٰ آنے والی چالیس نسلوں تک ایمان کے جاری ہونے کا فیصلہ فرما دیتے ہیں۔ تو دعاؤں میں اولاد کو بھی یاد رکھنا چاہیے۔

نیک اولاد کا غم ایک فطری غم:

یہ ذہن میں رکھیں کہ اولاد کا نیک ہونا یہ ایک فطری غم ہے، یہ ہر کسی کو ہوتا ہے۔ یہ غم ماں کو بھی ہوتا ہے اور باپ کو بھی ہوتا ہے۔ دونوں فکر مند ہوتے ہیں کہ ہونے والی اولاد نیک بنے۔ نبی علیہ الصلوٰۃ والسلام نے امت پر یہ احسان فرمایا اور ان کو یہ نکتہ سمجھایا کہ جب تم

اپنی بیوی سے ہم بستری کرو تو اس وقت یہ دعا مانگو۔

((اَللّٰھُمَّ جَنِّبْنَا الشَّیْطٰنَ وَ جَنِّبِ الشَّیْطٰنَ مَا رَزَقْتَنَا))

(بخاری شریف:۳۰۳۱)

''اے اللہ! ہماری بھی شیطان سے حفاظت فرما اور ہماری ہونے والی اولاد کی بھی شیطان سے حفاظت فرما''

حالانکہ ابھی بنیاد پڑ رہی ہے، ابھی امید لگ رہی ہے اور اسی وقت سے ماں باپ کے دل میں یہ فکر ہے کہ ہونے والی اولاد نیک بن جائے۔آج کتنے لوگ ہیں جن کو یہ دعا یاد ہے یا وہ پڑھتے ہیں؟ جب بنیاد ہی وہ غلط رکھ لیتے ہیں تو بعد میں اولاد کے نیک نہ بننے کے شکوے کس بات کے؟ تو دیکھیے! ابھی بچہ ماں کے پیٹ میں ہے اور ماں کو فکر ہوتی ہے۔

ماں کا غم:

چنانچہ عمران علیہ السلام کی زوجہ حاملہ ہیں۔انہیں نہیں پتہ کہ بیٹا ہوگا یا بیٹی ہوگی مگر وہ دعا مانگتی ہیں:

﴿رَبِّ اِنِّیْ نَذَرْتُ لَکَ مَا فِیْ بَطْنِیْ مُحَرَّرًا فَتَقَبَّلْ مِنِّیْ﴾

(آلِ عمران:۳۶)

''اے اللہ! جو میرے بطن میں ہے، میں نے اسے آپ کے دین کے لیے وقف کر دیا، اللہ! تو اسے قبول کر لے۔''

اب اس ماں کے عاجزانہ ہاتھ اٹھ رہے ہیں۔ابھی تو بچہ وجود میں بھی نہیں آیا، دنیا کے اندر نہیں آیا، ماں کے پیٹ میں ہی ابھی بن رہا ہے مگر اس کے لیے دعا مانگ رہی ہیں۔آج کتنی عورتیں ہیں جو حمل کے دوران یہ دعائیں مانگتی ہیں؟ جب حاملہ

عورت ٹی وی کے سامنے بیٹھ کر گانے سنے گی، سکرین پر تھرکتے جسموں کو دیکھے گی، تو کیا اس کے پیٹ سے اولیا پیدا ہوں گے؟

شریعت نے کہا کہ اگر عورت حاملہ ہو تو خاوند کو چاہیے کہ وہ اس کو بلا وجہ بغیر کسی ضروری شرعی وجہ کے ڈانٹ ڈپٹ نہ کرے۔ کیوں؟ عورت غمزدہ ہو گی اور ڈپریشن میں چلی جائے گی تو اس ڈپریشن کا اثر ہونے والے بچے پر پڑے گا۔ حاملہ عورت کا اتنا خیال کرنے کا حکم دیا گیا کہ بچے پر اثر نہ پڑے۔ فقہا نے کہا کہ عورت اگر اچھی سوچیں سوچے تو ہونے والے بچے کی شخصیت اعلیٰ ہوتی ہے۔ اور اگر گناہوں بھری سوچیں رکھے تو ہونے والے بچے پر بھی اس کے اثرات ہوتے ہیں اور وہ بدکار طبیعت کا بچہ ہوتا ہے۔ اس لیے آج دنیا کے ڈاکٹروں نے بھی ان باتوں کی تصدیق کی، چنانچہ حمل کے دوران جو عورت خوب دودھ پیے تو ہونے والا بچہ صحت مند بھی ہوتا ہے اور سفید رنگ کا خوبصورت بھی ہوتا ہے۔ تو حاملہ عورت بھی بچے کے لیے فکر مند ہے۔ جب دورانِ حمل بچے کے لیے ماں فکر مند ہے تو جس وقت ولادت ہو گئی تو پھر کتنی فکر ہو گی۔ کوئی اندازہ کر سکتا ہے کہ ماں کا دل اولاد کے لیے کتنا تڑپ رہا ہوتا ہے؟

عام طور پر یہ دیکھا گیا ہے کہ اپنے اپنے نصیب ہوتے ہیں، اولاد جب بگڑ جاتی ہے تو ڈانٹ ڈپٹ ماں کی ہو رہی ہوتی ہے۔ اب اس بیچاری نے تو بچے کو نہیں کہا کہ برے بنو۔ وہ تو سمجھاتی رہی، کہتی رہی، مگر ماحول کا اثر ہو گیا یا بچہ ہی ایسا نکلا۔ اب اِدھر سے خاوند طعنے دے رہا ہوتا ہے کہ تو نے تربیت صحیح نہیں کی۔ اُدھر سے اولاد کی بدحالی پر دل رو رہا ہوتا ہے۔ تو عورت کو یہ غم کتنا ہوتا ہے، شاید مرد اس کا اندازہ نہیں لگا سکتا۔ اس لیے اللہ تعالیٰ کے ہاں ماں کی آنکھ سے نکلے ہوئے غم کے ایک آنسو کا بھی بڑا مقام ہوتا ہے۔

باپ کا غم:

اب یہ فکر ماں کو بھی ہے اور باپ کو بھی ہے۔ حضرت یعقوب علیہ السلام کی مثال قرآن مجید میں دی گئی کہ اللہ تعالیٰ نے ان کو بارہ بیٹے عطا کیے تھے، وہ ان کے لیے فکر مند رہتے تھے، ان کو سمجھاتے رہتے تھے، ان کے لیے دعائیں کرتے تھے۔ اولاد ان کا دل دکھاتی تھی وہ دعائیں کرتے تھے۔

﴿فَصَبْرٌ جَمِيْلٌ وَ اللّٰهُ الْمُسْتَعَانُ عَلٰى مَا تَصِفُوْنَ﴾ (یوسف:۱۸)

''میں صبر کرتا ہوں اور اللہ ہی سے مدد طلب کی جاتی ہے ان باتوں پر جو تم بیان کرتے ہو''

بہت غم زدہ ہوتے تھے تو وہ کہتے تھے:

﴿اِنَّمَآ اَشْكُوْا بَثِّيْ وَ حُزْنِيْۤ اِلَى اللّٰهِ﴾ (یوسف:۸۶)

''میں تو اپنی پریشانی اور غم کا اظہار اللہ ہی کے سامنے کرتا ہوں''

حتیٰ کہ اولاد کے کرتوت جب کھلے کہ انہوں نے یوسف علیہ السلام کے ساتھ کیا کیا۔ تو فرمانے لگے:

﴿سَوْفَ اَسْتَغْفِرُ لَكُمْ رَبِّيْ﴾

''میں تمہارے لیے اللہ سے استغفار کروں گا۔''

تو باپ کا کردار دیکھیے: قرآن کی روشنی میں کہ بچوں کو سمجھا بھی رہا ہوتا ہے، اور ان کے نیک بننے کی اللہ سے دعائیں بھی مانگ رہا ہوتا ہے۔ پھر بچے بدکاریاں کرتے ہیں تو صبر بھی کر رہا ہوتا ہے۔ جبر سے کام نہیں چلتا...... فقط دو جوتے لگا دینے سے کام نہیں چلتا...... مار سے کام نہیں چلتا، پیار سے کام چلتا ہے۔ بچہ کو محبت دیجیے، پیار دیجیے۔ اس لیے کہ بچے مولٹن میٹل کی طرح ہوتے ہیں۔ جس سانچے میں ان کو ڈال

دیا جائے وہ اسی سانچے میں ڈھل جاتے ہیں۔ یہ اولاد کے نیک بننے کا غم باپ کے سر پر پوری زندگی سوار رہتا ہے۔

اب ذرا ایک مثال سن لیجیے! ایک بچہ اپنے باپ کے ساتھ مسجد میں نماز پڑھنے جاتا ہے اور عمر ابھی اس کی تین سال ہے۔ تین سال کے بچے نے نماز یاد کر لی، ہم نے تین سال کے بچے کو نماز پڑھتے دیکھا ہے۔ اب وہ تین سال کا بچہ یا پانچ سال کا بچہ اس معصوم سی عمر میں اللہ تعالیٰ سے دعا مانگتا ہے، تو اس دعا میں وہ اللہ سے کیا مانگتا ہے۔

﴿رَبِّ اجْعَلْنِیْ مُقِیْمَ الصَّلٰوۃِ وَ مِنْ ذُرِّیَّتِیْ﴾ (ابراہیم:۴۰)

''اللہ! مجھے بھی نماز کا پابند بنا دے اور میری اولاد کو بھی نماز کا پابند بنا دے''

اب اس پانچ سال کے بچے کی اولاد تو نہیں ہے، دور دور تک اس کی اولاد ہونے کا نشان بھی نہیں ہے۔ یہ تو ابھی پھلے پھولے گا جوان ہوگا، پھر شادی ہوگی، پھر اولاد ہوگی مگر یہ پانچ سال کی عمر میں دعا کر رہا ہے۔ کیوں یہ حکم دیا گیا؟ اس لیے کہ اللہ تعالیٰ کے علمِ غیب میں موجود ہے کہ آنے والے وقت میں اس بچے کی اولاد ہوگی، مگر اس ہونے والی اولاد کے لیے اس بچے کی زبان سے دعائیں پانچ سال کی عمر میں منگوانی شروع کر دیں۔ تم معصوم زبان سے ہونے والی اولادوں کے لیے دعائیں مانگو، ہم تمہاری اپنے وقت میں ہونے والی اولاد کو نیک بنا دیں گے۔

باپ کو یہ غم بچپن سے شروع ہوتا ہے اور جب تک جسم میں جان ہوتی ہے، یہ غم موجود رہتا ہے۔ چنانچہ یعقوب علیہ السلام کا تذکرہ اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید میں فرمایا:

﴿أَمْ كُنتُمْ شُهَدَآءَ إِذْ حَضَرَ يَعْقُوبَ الْمَوْتُ إِذْ قَالَ لِبَنِيهِ مَا تَعْبُدُونَ مِن بَعْدِىْ﴾ (البقرۃ:۱۳۳)

''کیا تم اس وقت حاضر تھے جب یعقوب علیہ السلام کو موت آنے لگی، اس وقت انہوں نے کہا: میرے بیٹو! تم میرے بعد کس کی عبادت کرو گے؟''

اس موت کے وقت بھی وہ اپنے بچوں کو بلاتے ہیں اور پوچھتے ہیں: میرے بیٹو! تم میرے بعد کس کی عبادت کرو گے؟ تو موت تک اولاد کا غم رہتا ہے۔ اِدھر مر رہے ہیں اور اُدھر اولاد کا غم ہے، اس وقت بھی توحید کی تعلیم دے رہے ہیں۔ انہوں نے کہا: آپ کا جو خدا ہے، جو تصور آپ نے دیا ہم اسی کی عبادت کریں گے، ہم شرک سے بچیں گے۔ اب اطمینان ہو گیا۔ تو معلوم ہوا کہ اولاد کا غم بچپن سے لے کر مرنے تک انسان کے دل میں موجود ہوتا ہے۔

اعمالِ صالحہ کی توفیق کی دعا:

تو ابراہیم علیہ السلام نے اپنے لیے بھی دعا مانگی اور آنے والی اولادوں کے لیے بھی دعا مانگی اور پھر یہ کہا:

﴿وَ أَرِنَا مَنَاسِكَنَا وَتُبْ عَلَيْنَا إِنَّكَ أَنْتَ التَّوَّابُ الرَّحِيْمُ﴾

(البقرۃ:۱۲۸)

''ہمیں حج کا طریقہ سکھا دیجیے اور ہماری توبہ کو قبول فرمائیے! بے شک آپ معاف کرنے والے مہربان ہیں''

اللہ سے دعا کر رہے ہیں کہ اے اللہ! ہمیں اس بیت اللہ میں مناسکِ حج ادا کرنے کی توفیق عطا فرمائیں۔

یادگار وقت میں یادگار دعا:

ابراہیم علیہ السلام محرم راز تھے وہ اس بات کو اچھی طرح سمجھتے تھے کہ مزدور جب

مزدوری کرتا ہے تو کام مکمل کرنے پر اسے اجرت ملا کرتی ہے۔ اس لیے اس وقت جو میں مانگ رہا ہوں وہ پورا ہوگا۔ واقعی ہم نے گھروں میں دیکھا ہے ہم جیسا کوئی عام آدمی بھی گھر میں کوئی ایئر کنڈیشنر کا کام کرواتا ہے تو پہلے مکینک سے پیسے طے کرتے ہیں کہ کتنے پیسے لو گے؟ وہ جو پیسے بتاتا ہے وہ کچھ مناسب لگتے ہیں تو پھر کام کرواتے ہیں، لیکن جو امیر لوگ ہوتے ہیں، وہ کہتے ہیں الیکٹریشن کو لاؤ کام ٹھیک کرے جو پیسے کہے گا دے دیں گے۔ تو اگر امیر بندے کا رسپانس یہ ہے کہ جو کہے گا دے دیں گے۔ اللہ تعالیٰ تو پھر مالک الملک ہیں۔ اگر کسی نے اس احکم الحاکمین کا گھر بنایا تو وہ اس سے مزدوری تھوڑی مقرر کریں گے، وہ کہیں گے مانگ کیا مانگتا ہے؟ ابراہیم علیہ السلام چونکہ اللہ کے پیغمبر تھے، انہیں پتہ تھا کہ یہ مانگنے کا اور ملنے کا وقت ہے، تو انہوں نے مانگا اور دل کھول کر مانگا کہ اللہ! آپ نے قبولیت کا اظہار فرمادیا میں بھی وہ نعمت مانگوں گا جو تیرے خزانے میں صرف ایک ہے، دوسری ایسی ہے ہی نہیں۔ اللہ فرماتے ہیں: میرے ابراہیم! میرے خزانوں کا تو کوئی حدو حساب ہی نہیں...... کہتے ہو میرے خزانے میں بھی ایک ہے؟ ابراہیم علیہ السلام فرماتے ہیں جی! میں وہ نعمت مانگتا ہوں۔ یہ عام بندے کی دعا نہیں، یہ محرم راز، اللہ کے پیغمبر علیہ السلام کی دعا ہے جو اس کی عظمت کو جانتا ہے، اس کے خزانوں کو جانتا ہے۔ انہوں نے مانگنے کی بھی انتہا کر دی۔ اچھا میرے ابراہیم علیہ السلام! مانگو کیا مانگتے ہو؟ فرماتے ہیں: میں آپ سے دنیا کا مال و منال نہیں مانگتا، میں دنیا کا فضل و کمال نہیں مانگتا، اللہ! میں آپ سے فقط آمنہ کا لال مانگتا ہوں۔

﴿رَبَّنَا وَابْعَثْ فِيهِمْ رَسُولًا مِّنْهُمْ﴾

''اے اللہ! ان میں رسول کو بھیج دیجیے''

......اللہ مسجد میں نے بنا دی، عبادت سکھانے والے کو بھیج دیجیے۔

......مدرسہ میں نے بنا دیا، علم سکھانے والے کو بھیج دیجیے۔

......تیرا گھر میں نے بنا دیا اس گھر کو آباد کرنے کے لیے محبوب علیہ السلام کو بھیج دیجیے۔

ابراہیم علیہ السلام نے دعا مانگی اور وہ قبول ہوئی۔ چنانچہ نبی علیہ الصلوٰۃ والسلام فرمایا کرتے تھے:

''میں ابراہیم علیہ السلام کی دعا کی قبولیت بن کر دنیا میں آیا ہوں''۔

ہم بھی دعا کریں:

ہم بھی اللہ سے دعا مانگیں: اللہ! ہماری اولادوں کو نیک بنا دیجیے! جیسے حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اپنی نسل میں نبی علیہ الصلوٰۃ والسلام کی بعثت کے لیے دعا مانگی ہم بھی تو دعا مانگ سکتے ہیں۔ اے اللہ! ابراہیم علیہ السلام کی دعا کے صدقے آپ نے نبی علیہ الصلوٰۃ والسلام کو دنیا میں بھیجا، میں عاجز مسکین یہ دعا کرتا ہوں میری آنے والی نسلوں میں:

......کوئی وقت کا ولی پیدا کر دیجیے!

......کوئی وقت کا مجدد پیدا کر دیجیے!

......کوئی اپنا عاشق پیدا کر دیجیے!

یہ مسجد بنانے کا وقت یادگار وقت ہوتا ہے۔ ہم بھی آج ایسی قبولیتِ دعا کے وقت میں یہاں پر موجود ہیں۔

مسجد اللہ کا گھر

اللہ نے مسجد کو بیت اللہ یعنی اپنا گھر کہا:

﴿وَ عَهِدْنَآ اِلٰٓى اِبْرٰهٖمَ وَ اِسْمٰعِيْلَ اَنْ طَهِّرَا بَيْتِيَ﴾

(البقرۃ:۱۲۵)

''بیتی'' کا مطلب ہوتا ہے میرا گھر۔ یہ جو میرے کی نسبت تھی، اس نے بیت اللہ کی عظمت کو چار چاند لگا دیے۔ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں: میرا گھر۔ جب وہ احکم الحاکمین، وہ پروردگارِ عالم فرمائے کہ یہ میرا گھر ہے تو پھر سوچیے! بات کہاں پہنچتی ہے؟ تو اللہ تعالیٰ نے بیتی کا لفظ کہہ کر اپنے گھر کو عزت دے دی کہ یہ میرا گھر ہے۔ چنانچہ نسبت سے عزت مل جاتی ہے۔

دو اینٹیں ایک ہی بھٹے میں بنیں، ایک کو الٹی کی ہیں، دونوں کی قیمت بھی ایک جیسی ہے۔ آپ نے خریدا اور ان میں سے ایک کو بیت الخلا میں لگا دیا، دوسری کو مسجد میں لگا دیا، جس کو بیت الخلا میں لگایا اس کے اوپر آپ ننگا پاؤں رکھنا پسند نہیں کرتے اور جس کو آپ نے مسجد میں لگایا اس کے اوپر اپنی پیشانی کو ٹیکتے ہیں۔ نسبت نے عزت بڑھا دی۔ تو ''بیتی'' کے لفظ نے بیت اللہ کو ایک شان عطا کر دی۔

مساجد...... بیت اللہ کی بیٹیاں:

ساری دنیا میں جو مسجدیں ہیں یہ
بیت اللہ کی شاخیں ہیں۔
بیت اللہ کی شعاعیں ہیں۔
بیت اللہ کی بیٹیاں ہیں۔

جہاں بھی مسجد بن رہی ہے، یہ بیت اللہ کی بیٹی بن رہی ہے، بیت اللہ کی شاخ بن رہی ہے۔ تو مسجد کو پھر ایک عزت مل گئی۔ اسی لیے جب قیامت آئے گی اور بیت اللہ کو بلایا جائے گا تو دنیا میں جتنی بھی مساجد کی زمین ہوگی، ان سب کو بیت اللہ کی زمین کے اندر اکٹھا کر کے اٹھائیں گے اور جنت کا حصہ بنا دیں گے ۔

مسجد مسلمانوں کا محور و مرکز:

اس لیے لوگوں کی زندگیوں میں مسجد کو ایک محور اور مرکز کی حیثیت حاصل ہوتی ہے۔مومن کی زندگی مسجد کے اعمال کے گرد گھوم رہی ہوتی ہے، کافر کی زندگی پیٹ کے گرد گھوم رہی ہوتی ہے۔کھانے کا چکر......دنیا میں انجوائے کرنے کا چکر۔اس لیے ہمارے اسلاف جب کہیں جا کر بسنا چاہتے تھے تو مسجد پہلے بناتے تھے۔

سیدنا عمر رضی اللہ عنہ نے اپنے گورنروں کو لکھا کہ مجھے ذرا سروے کر کے ایسی جگہ بتائیں جہاں میں مسلمانوں کی طاقت اور حفاظت کے لیے ایک چھاؤنی بنا سکوں مگر شرط یہ ہے کہ اس جگہ اور مدینے کے درمیان کوئی دریا حائل نہیں ہونا چاہیے۔

چنانچہ اس وقت کے جو اہلِ رائے تھے انہوں نے بتایا کہ جی! کوفہ ایسی جگہ ہے جہاں پر آپ مسلمانوں کی چھاؤنی بنا سکتے ہیں۔ یہاں رہتے ہوئے ہم اسلامی سرحدوں کی حفاظت اچھے طریقے سے کر سکتے ہیں۔چنانچہ عمر رضی اللہ عنہ نے اس کا ڈیزائن سیدنا علی رضی اللہ عنہ کے سپرد کیا۔یہ شہر Plawned (منصوبہ بندی کے تحت بنایا گیا) شہر تھا جو بسایا گیا۔شہر کے سنٹر میں مسجد بنائی گئی۔یہ نیوکلیس ہے مسلمانوں کے لیے، جیسے نیوکلیس کے اندر الیکٹران گھوم رہے ہوتے ہیں، اسی طرح مسجد مسلمانوں کا سنٹر ہے اور مسلمانوں کے اعمال اس کے گرد گھومتے ہیں۔مسجد بن گئی۔تو عمر رضی اللہ عنہ نے حکم دیا کہ مسجد کے بالکل پڑوس میں جو سادات ہیں، سید گھرانے کے لوگ ہیں، جن کی نبی علیہ الصلوٰۃ والسلام سے پکی نسبت ہے، ان کے گھر بنا دیے جائیں۔چنانچہ سادات کے گھران کی شرافت کی بنا پر قریب قریب بنائے گئے۔جب یہ مکمل ہو گئے تو پھر علما اور فقہا کے گھر بنائے گئے۔جب وہ مکمل ہو گئے تو اس کے بعد عوام الناس کے گھر بنائے گئے۔جب وہ مکمل ہو گئے تو اس کے بعد فوجیوں کے گھر بنائے گئے، پھر شہر کے گرد فصیل کر دی

گئی۔ یوں سمجھیں کہ جیسا فیصل آباد ایک شہر ہے۔اس کے اندر گھنٹہ گھر ایک جگہ ہے اس کے چاروں طرف بازار بنائے گئے ہیں۔تو کوفہ میں بھی مسجد کو مرکز بنایا گیا اوراس کے گرد دوسری ساری جگہوں کو بنا کر اس شہر کو آباد کیا گیا۔ بیان کرنے کا مقصد یہ کہ اسلام میں مسجد کو مرکزی حیثیت حاصل ہے۔

مدنی زندگی کا آغاز، تعمیرِ مسجد سے:

خود نبی علیہ الصلوٰۃ والسلام جب ہجرت کر کے مدینہ طیبہ تشریف لائے تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے سب سے پہلے مسجد تعمیر فرمائی۔اس مسجد کا نام تھا مسجدِ قبا۔ یہ اسلام کی پہلی مسجد تھی۔ ایمان والوں کی سرگرمیوں کی ابتدا یہاں سے ہوتی ہے، لہٰذا ہر آبادی میں مسجد کو ضرورت کے حساب سے لازمی ہونا چاہیے۔

مسجد کے متعلق تین قرآنی حکم:

مسجد کی تعمیر عام گھروں کی نسبت بہتر ہونی چاہیے۔اگر لوگوں کے گھر کچے ہوں تو ہم مسجد پکی اینٹوں کی بنائیں۔ اللہ کا گھر ہے، خوبصورت ہونا چاہیے۔اگر لوگوں کے گھر پکی اینٹوں کے ہوں تو ہم مسجد کے اندر پلاسٹر لگائیں۔اور اگر گھر پلاسٹر کے بنیں ہیں تو پھر ہم مسجد کے اندر ماربل بھی لگائیں گے، چپس بھی لگوائیں گے۔اور اگر گھر بھی محلات کی طرح بنے ہوئے ہیں۔تو پھر یہ تو شہنشاہِ حقیقی کا گھر ہے اس کو اس سے بھی بہتر اور اونچا بناؤ، قرآن مجید میں اس بات کا حکم ہے:

○ ﴿فِیْ بُیُوْتٍ اَذِنَ اللّٰہُ اَنْ تُرْفَعَ﴾ (النور:۳٦)

''یہ گھر ہیں جن کو اونچا بنانے کا اللہ نے حکم فرمایا''

عام گھروں کی نسبت مسجد کو بلندی میں بھی اونچا ہونا چاہیے اور کھلی اور ہوادار بھی

ہونی چاہیے۔اور مفسرین نے یہ بھی لکھا کہ کوالٹی بھی عام گھروں سے اونچی ہونی چاہیے۔

بعض لوگوں کو دیکھا، کہتے ہیں جی بس مسجد کو بالکل سادہ بناؤ۔ جی بس چونا کروالو باقی خیر ہے۔ جب تمہارا اپنا گھر بن رہا تھا تو اس وقت تمہیں چونا یاد کیوں نہیں تھا؟ اس وقت تو بیوی کو خوش کرنے کے لیے گھر میں ماربل لگوایا۔اب خدا کا گھر بن رہا ہے تو اب زاہد بن کر آ گیا کہ اب چونا کافی ہے۔ یہ تمہاری عدمِ توجہی ہے، یہ تمہاری اللہ سے محبت میں کمی کی دلیل ہے۔محبت ہوتی تو کہتے کہ میں اللہ کا محل بناؤں گا۔

چلیں جی! اب عالیشان مسجد تو بنادی، اب اگلا کام بھی تو ہے۔ اگلا حکم، فرمایا:

○ ﴿ وَيُذْكَرَ فِيهَا اسْمُهُ يُسَبِّحُ لَهُ فِيهَا بِالْغُدُوِّ وَالْآصَالِ﴾

''اور اس میں اللہ کے نام کا ذکر کیا جائے، صبح و شام اپنے اللہ کی تسبیح بیان کرتے ہوں''

رب کا نام کیا ہے؟ ''اللہ''۔تو یہ آیت بتا رہی ہے کہ اس میں اللہ کے نام کا ذکر کیا جائے۔ یہاں پر تو ویسے بھی ذکر و مراقبہ کرنے والے لوگ ہیں۔ یہ مسجد بنے گی تو یہاں ''اللہ اللہ'' ہوگی...... ماشاء اللہ...... بالکل قرآن مجید کی آیت کے مطابق عمل ہوگا۔

آگے فرمایا:

○ ﴿رِجَالٌ لَّا تُلْهِيهِمْ تِجَارَةٌ وَّلَا بَيْعٌ عَنْ ذِكْرِ اللّٰهِ وَإِقَامِ الصَّلٰوةِ وَإِيْتَاءِ الزَّكٰوةِ﴾

''یہاں ایسے لوگ ہوں جن کو خرید و فروخت، اللہ کی یاد سے غافل نہ کرے وہ یہاں نمازیں قائم کریں، زکوۃ ادا کریں''

﴿يَخَافُونَ يَوْمًا تَتَقَلَّبُ فِيهِ الْقُلُوبُ وَالْأَبْصَارُ﴾ (النور:۳۷)

''اس دن سے ڈرتے ہیں جس دن دل اور آنکھیں الٹ جائیں گی''

معلوم ہوا کہ یہاں خوفِ خدا رکھنے والوں کی جماعت ہونی چاہیے، لہٰذا مسجد بنانے والوں کو یہ باتیں کان کھول کر سن لینی چاہییں کہ

(۱)......مسجد جب بھی بنائیں تو عام گھروں سے بہتر بنائیں۔

(۲)......پھر اس مسجد کو عبادت سے منور کریں۔

(۳)......اور پھر اس میں ایسے لوگوں کی جماعت ہو جو اللہ سے ڈرنے والے ہوں، یعنی گناہوں سے بچنے والے ہوں۔

یہ وہ جگہ ہوگی جو اللہ کے ہاں قبول ہوگی۔ تو مقصود یہ ہے کہ یہاں پر اللہ کا خوف دل میں رکھنے والے بندوں کی ایک جماعت ہونی چاہیے۔

مومن کا دل مسجد میں اٹکتا ہے:

اگر کسی سے محبت ہو تو اس کے گھر سے بھی محبت ہوتی ہے، اس کے گلی کوچے سے بھی محبت ہوتی ہے، آدمی محبوب کے پڑوس میں رہنے کی کوشش کرتا ہے۔ کسی نے مجنوں کو دیکھا کہ کتے کے پاؤں چوم رہا تھا۔ پوچھا کیا کر رہے ہو؟ کہنے لگا: یہ کتا ابھی لیلیٰ کی گلی سے ہو کر آیا ہے۔ اس کے قدموں کو چوم رہا ہوں کہ یہ لیلیٰ کی گلی میں لگ کر آئے ہیں۔ اگر نفسانی محبتوں والے یوں اپنی محبت کا اظہار کرتے ہیں تو جس جگہ اللہ کا گھر بنے تو مومن کو اس جگہ سے محبت کا کتنا اظہار کرنا چاہیے۔ اس لیے فرمایا گیا:

((اَلْمُؤْمِنُ فِي الْمَسْجِدِ كَالسَّمَكِ فِي الْمَاءِ)) (کشف الخفاء:۲/۳۸۸)

''مومن مسجد میں اس طرح ہوتا ہے جیسے مچھلی پانی میں''

تو مومن کا دل مسجد کے اندر اٹکتا ہے۔ مومن مسجد میں اس طرح پرسکون ہو جاتا

ہے، جیسے مچھلی پانی کے اندر آ کر پرسکون ہو جاتی ہے۔

مسجد سے دل لگانے والا عرش کے سائے میں:

حدیث پاک میں ہے کہ قیامت کے دن چند لوگوں کو اللہ تعالیٰ عرش کے سائے میں جگہ عطا فرمائیں گے۔ ان میں ایک وہ بندہ بھی ہے جس کا دل مسجد کے اندر اٹکا رہتا ہو (صحیح البخاری، رقم: ۶۲۰)۔ یعنی وہ کام کاج کے لیے گھر آئے، دفتر جائے، یا دنیا کے دوسرے معاملات کرے تو وہ پریشان رہے، اور جیسے ہی فارغ ہو فوراً مسجد پہنچے اور وہاں جا کر اسے سکون آئے۔ ایسے لوگوں کو قیامت کے دن کے سائے کی بشارت ملی ہے۔

مسجد میں بیٹھنے کی تعلیم:

اس لیے نبی علیہ الصلوٰۃ والسلام نے ایسے اعمال سکھائے جن میں اس بات کی تعلیم دی گئی کہ انسان مسجد میں بیٹھنے کا عادی بنے۔ مثلاً فرمایا:

((مَنْ صَلَّى الْفَجْرَ فِي جَمَاعَةٍ ثُمَّ قَعَدَ يَذْكُرُ اللّٰهَ تَعَالٰى حَتّٰى تَطْلُعَ الشَّمْسُ ، ثُمَّ صَلّٰى رَكْعَتَيْنِ كَانَتْ لَهٗ كَأَجْرِ حَجَّةٍ وَ عُمْرَةٍ)) (کنز العمال، رقم: ۲۱۵۰۸)

''جو شخص فجر کی نماز پڑھ کر اپنی جگہ پر بیٹھا رہے، سورج طلوع ہونے تک ذکر وعبادت کرتا رہے، اور پھر اگر دو رکعت نفل پڑھ لے تو دو رکعت پڑھنے پر اللہ تعالیٰ ایک حج یا ایک عمرے کا ثواب عطا فرمائیں گے''

یہ فجر سے اشراق تک بیٹھنے کی فضیلت اسی لیے بتائی کہ ایمان والوں کو مسجد میں بیٹھنے کی عادت ہو جائے۔

فرمایا کہ جمعہ کے دن جو شخص لوگوں سے پہلے مسجد میں آجاتا ہے اس کو اللہ تعالیٰ زیادہ انعام دیتے ہیں۔حتیٰ کہ پچھلے جمعہ سے لے کر اس جمعہ تک جتنے گناہ کیے اللہ سب گناہوں کو معاف فرما دیتے ہیں۔(صحیح البخاری، رقم: ۶۲۰)

پھر فرمایا کہ جمعہ کے دن عصر سے مغرب تک جو اسی (۸۰) مرتبہ درود شریف پڑھے، اس کے اسی (۸۰) سال کے گناہوں کو معاف فرما دیں گے (القول البدیع: ۲۸۴)۔تو یہ فضائل بتا رہے ہیں کہ نبی علیہ الصلوٰۃ والسلام کی منشا یہ تھی کہ مومن مسجد میں بیٹھنے کی عادت ڈالے۔

مسجد بیزار لوگ:

آج کتنے لوگوں کو مسجد میں بیٹھنے کی عادت ہے۔ٹی وی کے آگے تو روزانہ چار پانچ گھنٹے بیٹھتے ہیں۔چلو بیوی کے آگے بیٹھتے تو کچھ فائدہ ہی ہوتا۔اور اگر کہیں کہ مسجد میں بیٹھ جاؤ تو مسجد میں تو دم گھٹتا ہے۔ہم نے دیکھا ہے کہ فسق و فجور میں پڑا ہوا بندہ جب مسجد میں چلا جائے تو اس کی طبیعت بیزار ہو جاتی ہے۔ جیسے ہی مسجد سے نکلتا ہے تو وہ اپنا گلا ٹھیک کرتا ہے اور ایسے لگتا ہے کہ پتہ نہیں کس مصیبت میں سے نکل کر آیا ہے۔تو یہ چیز اللہ تعالیٰ سے وحشت ہونے کی دلیل ہے۔مسجد سے محبت اللہ تعالیٰ سے محبت کی دلیل ہے اور مسجد سے وحشت اللہ سے وحشت کی دلیل ہے۔

کون مسجد میں نہیں آنے دیتا؟

کتابوں میں ایک مزدور کا واقعہ لکھا ہے۔کسی نے مزدور کو کہا کہ بھئی! میری مچھلی میرے گھر پہنچا آؤ۔اس نے کہا کہ اس شرط پر پہنچاؤں گا کہ نماز کا وقت ہو گیا تو پہلے نماز پڑھوں گا پھر آگے چلوں گا۔اس نے کہا: ٹھیک ہے۔راستے میں نماز کا وقت ہو گیا

اور وہ مزدور نماز پڑھنے مسجد میں چلا گیا۔ اب یہ صاحب مسجد کے باہر کھڑے انتظار کر رہے ہیں کہ کب وہ نماز پڑھ کر باہر آئیں تو پھر آگے چلیں۔ کچھ دیر گزری تو انہوں نے آواز لگائی کہ بہت دیر ہوگئی ہے تم باہر کیوں نہیں آتے؟ کوئی جواب نہ آیا۔ پھر تھوڑی دیر بعد چلا کر کہا کہ ارے کون تمہیں باہر نہیں آنے دیتا؟ تو اس نے کہا: جناب! جو آپ کو اندر نہیں آنے دیتا وہ مجھے باہر نہیں آنے دیتا۔ تو یہ بھی اللہ کی توفیق ہوتی ہے جو کسی کو مسجد میں بیٹھنے کی توفیق عطا کر دے۔

نبی علیہ الصلوٰۃ والسلام کی سنتِ مبارکہ:

نبی علیہ الصلوٰۃ والسلام سفر سے واپس تشریف لاتے تھے تو اپنے گھر میں جانے سے پہلے مسجد میں تشریف لاتے تھے اور دو رکعت نفل ادا فرماتے تھے پھر اس کے بعد گھر میں تشریف لے جاتے تھے۔ (المسلم: ۱/ ۴۷۶)

اللہ تعالیٰ کی تین پسندیدہ آوازیں:

جس جگہ مسجد بنتی ہے قریب کی آبادی کے لیے باعثِ رحمت ہوتی ہے۔ حدیثِ پاک میں ہے اللہ تعالیٰ تین آوازوں کی وجہ سے فرشتوں پر فخر فرماتے ہیں:

......ایک حاجی جب احرام باندھ کر ''**لبیك اللهم لبیك**'' پڑھتا ہے۔

......دوسرا مجاہد جو اللہ کے راستے میں ''اللہ اکبر'' کا نعرہ لگاتا ہے۔

......اور تیسرا بستی کی مسجد میں جب مؤذن ''اللہ اکبر'' کی آواز بلند کرتا ہے، اللہ کو بہت پیارا لگ رہا ہوتا ہے۔ (کنز العمال، رقم: ۴۳۲۳۰)

مؤذن کا احسان:

اور اللہ تعالیٰ مؤذن کی آواز کی وجہ سے بستیوں کے لوگوں کے عذاب میں جو پکڑ

ہوتی ہے اس کو Delay (مؤخر) فرما دیتے ہیں۔آج ہماری آبادیوں پر جو ظاہری طور پر عذاب نہیں آرہا۔اس میں گھر والوں کا کمال نہیں ہوتا، اس میں مسجد کے مؤذن کا کمال ہوتا ہے۔جب اذان ہوتی ہے تو جہاں تک آواز جاتی ہے شیطان بھاگتا ہے اور اس کی ریح خارج ہورہی ہوتی ہے۔اور اللہ اس پوری آبادی سے عذاب کو ٹال دیتے ہیں۔ورنہ یہ گھروں میں ڈرامے فلمیں اور نیوڈ کلب کی فلمیں، ننگی فلمیں، ان کو دیکھنے کے بعد عذاب کے آنے میں رکاوٹ کیا رہ جاتی ہے؟ محبوب صلی اللہ علیہ وسلم کی دعائیں کام آگئیں ۔ اللہ رب العزت نے ان کی دعاؤں کی لاج رکھ لی اور یہ مساجد کی اذانوں کی لاج ہوتی ہے ۔ اللہ تعالیٰ آبادیوں سے عذاب کو ٹال دیا کرتے ہیں۔ مؤذن کی اگرچہ تنخواہ تھوڑی ہوتی ہے، لیکن اس کا پورے محلے پر احسان ہوتا ہے۔ محلے والوں کو اس بات کی سمجھ نہیں کہ اگر وہ اذان نہ دیتا تو انہیں یہ کھانے کے ترلقمے نصیب نہ ہوتے۔

مؤذن کا انعام:

قیامت کے دن اللہ تعالیٰ مؤذن کو اس حال میں کھڑا کریں گے کہ اس کی گردن دوسروں سے اونچی ہوگی ۔ یہ اس کا اعزاز ہوگا کہ اس نے اللہ کے نام کو دنیا میں بلند کیا، اللہ آج اس کے سر کو دوسروں سے اونچا فرما رہے ہیں، کیونکہ اللہ کے ہاں دستور ہے کہ

جَزَاءٌ مِّنْ جِنْسِ الْعَمَلِ (جیسا عمل ویسی جزا)

چنانچہ جو اللہ کا نام بلند کرے، اللہ اس کا نام بلند کرتا ہے۔

عرش پر سیدنا بلال رضی اللہ عنہ کے قدموں کی چاپ:

ذرا غور کیجیے! کہ بلال رضی اللہ عنہ کی والدہ کا کیا نام ہے؟ آپ ڈھونڈنا چاہیں تو آپ کو کتابوں میں نہیں ملے گا۔ ان کے خاندان کی تفصیل معلوم کرنا چاہیں تو نہیں ملے گی۔ بس ایک معمولی درجہ کے غلام تھے اور زندگی گزار رہے تھے، مگر جب انہوں نے اسلام قبول کیا تو وہ نبی علیہ السلام کے مؤذن بنے۔ اب اللہ کا نام بلند کرنے پر اللہ نے ان کے نام کو بلند کیا۔ انہوں نے اللہ کا نام بلند کیا، اللہ نے ان کا نام اتنا بلند کیا کہ نبی علیہ السلام جب معراج پر تشریف لے گئے تو جنت کی سیر کرتے ہوئے نبی علیہ السلام نے کسی کے قدموں کے چلنے کی آواز سنی۔ پوچھا: جبرئیل! یہ آواز کیسی ہے؟ اے اللہ کے حبیب (صلی اللہ علیہ وسلم)! آپ کا غلام بلال فرش پر چلتا ہے، اس کے قدموں کی آواز عرش تک پہنچائی جاتی ہے۔ (صحیح ابن حبان، رقم الحدیث: ۷۰۸۶)

بلال رضی اللہ عنہ نے دنیا میں اللہ کے نام کو بلند کیا تھا، اللہ نے بلال کے نام کو عرش پر بلند کر دیا۔ اور دنیا میں ایسی عزتیں بخشیں کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ تشریف فرما ہیں اور مدینہ طیبہ کے بڑے بڑے سردار بھی موجود ہیں، امرا بھی موجود ہیں اور اس دوران حضرت بلال رضی اللہ عنہ تشریف لاتے ہیں تو عمر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: سیدنا بلال تشریف لے آئے۔ اللہ نے ان کا نام بلند کیا۔

فرمایا کہ اگر اذان کی فضیلت کا پتہ چل جائے تو اذان دینے کے لیے یہ لوگ ڈنڈوں سے ایک دوسرے کے ساتھ جھگڑا شروع کر دیں۔ جسے توفیق نصیب ہو جائے وہ خوش نصیب انسان ہے۔ اس لیے مسجد کے ساتھ دل اٹکا رہے، مسجد کے کاموں میں بندہ لگا رہے۔

خواتین میں خدمتِ مسجد کا جذبہ:

پہلے زمانے میں عورتیں رات کے وقت جب مسجد خالی ہو جایا کرتی تھی تو مسجد میں جھاڑو دیا کرتی تھیں۔ اور ہمارے مشائخ کی زندگیوں میں بھی یہ چیز ہے کہ جب مسجد خالی ہو جاتی تھی تو گھر کی عورتیں اپنے خاوندوں کے ساتھ جا کر مسجد کی صفائی کیا کرتی تھیں۔ وہ اللہ کے گھر کی صفائی کا کام اپنے ذمے لیتی تھیں۔

چنانچہ ایک صحابیہ تھیں جو مسجد نبوی کی صفائی کیا کرتی تھیں۔ اور نبی علیہ السلام فرمایا کرتے تھے کہ یہ عورت جب فوت ہو تو بتانا اس کا جنازہ میں نے ادا کرنا ہے۔ آج کونسی عورت ہے جس کے دل میں یہ چاہت ہو کہ اللہ کا گھر بنے گا تو اللہ کے گھر کی مٹی میں صاف کیا کروں گی؟ کتنے نوجوان ہیں جو مسجد کا کوئی کام اپنے ذمے لے لیں؟ حسرتیں ہی ختم ہو گئیں۔

وائے ناکامی متاعِ کارواں جاتا رہا
کارواں کے دل سے احساسِ زیاں جاتا رہا

تعمیرِ مسجد میں صحابہ رضی اللہ عنہم کا ذوق وشوق:

جب مسجد نبوی علی صاحبہا الصلوٰۃ والسلام کی تعمیر ہو رہی تھی تو صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم اپنے سر پر پتھر اٹھا اٹھا کر لا رہے تھے۔ ایک صحابی دو دو پتھر اٹھا کر لا رہے تھے۔ باقی تو ایک ایک لاتے اور یہ صحابی ایک کی جگہ دو دو پتھر لاتے۔ دوستوں نے دیکھا تو وہ ذرا مسکرائے۔ مقصد یہ تھا کہ یہ تو بڑے نمبر بنا رہا ہے۔ جب یہ کہا کہ یہ تو بڑے نمبر بنا رہا ہے تو نبی علیہ الصلوٰۃ والسلام نے فرمایا کہ ہاں! یہ وقت اللہ تعالیٰ سے محبت کے اظہار کا وقت ہے۔ اگر یہ دو پتھر اٹھا کر لا رہا ہے تو اللہ تعالیٰ سے لوگوں کی نسبت زیادہ محبت کا اظہار کرنے والا بن جائے گا۔

حدیث پاک میں ہے کہ اللہ کے نبی ﷺ نے خود بھی پتھر اٹھایا اور اپنے مبارک سر پر رکھا۔ سارے صحابہ دوڑے، اے اللہ کی نبی ﷺ! ہم غلام کس کام کے لیے ہیں؟ نبی علیہ الصلوٰۃ والسلام نے فرمایا کہ اگر تم اللہ سے محبت کا اظہار کرتے ہو تو مجھے بھی تو اللہ سے محبت کا اظہار کرنا ہے۔ اللہ کے حبیب ﷺ نے مسجد نبوی علی صاحبہا الصلوٰۃ والسلام کے لیے اپنے مبارک سر پر پتھر اٹھائے اور مسجد تک پہنچائے۔

وسط ایشیا کے لوگوں کی مسجد سے محبت:

اس لیے پہلے بزرگوں میں یہ عام بات تھی کہ جہاں مسجد بنتی تھی لوگ اس مسجد کا تعاون اپنا فرض سمجھتے تھے، مگر مالی تعاون کے ساتھ جسمانی تعاون بھی کرتے تھے۔ وہ مسجد کی خدمت میں Physicaly (جسمانی طور پر) حصہ لیتے تھے۔ اس عاجز کو اللہ رب العزت نے وسطِ ایشیا میں جانے کی توفیق عطا فرمائی۔ ہم نے وہاں پر جو ایمان والوں میں مسجد کی محبت دیکھی وہ حیران کن ہے۔ ہم ایک شہر میں گئے، جمعہ کی نماز ایک بجے ہوتی ہے۔ ہم لوگ سفر سے آئے تھے فجر پڑھ کر پھر سو گئے۔ دس بجے آنکھ کھلی تو ہم نے کہا: چلو اب جمعہ کی تیاری کرتے ہیں، شاور لیتے ہیں۔ میں غسل کے لیے باہر نکلا تو دیکھا کہ مسجد بھری ہوئی تھی، کم از کم چھ سات سو بندے موجود ہوں گے۔ میں سمجھا پتہ نہیں یہ کیوں اکٹھے ہو گئے ہیں، کوئی جنازہ پڑھنا ہے یا کوئی اور وجہ؟ امام صاحب ہمارے ساتھ تھے، میں نے پوچھا کہ یہ مسجد کیوں بھری ہوئی ہے؟ کہنے لگے: جمعے کی نماز ایک بجے ہوتی ہے، ہمارے ہاں یہ دستور ہے کہ جمعہ کے دن عوام الناس دس بجے ہی مسجد میں آ جاتے ہیں۔ دس بجے سے لے کر ایک بجے تک تین گھنٹے مسجد کے اندر بیٹھ کر تلاوت کرتے ہیں، ذکر کرتے ہیں، اللہ کی عبادت کرتے ہیں۔

ہمارے ہاں تو گھر بیٹھے ہوئے جائزہ لیتے رہتے ہیں۔ ہاں! اب امام صاحب

کی تقریر شروع ہوئی......اب سنتوں کا وقفہ ہوا......اب دوسری اذان ہوگئی......اب امام صاحب نے خطبہ پڑھ لیا......اور ہم تو ایک منٹ میں پہنچ جاتے ہیں، جب امام اپنے خطبے کو سمیٹنے لگتا ہے اور یہ دیکھتے ہیں کہ اب اس نے کہا ہے:

اِنَّ اللّٰهَ يَأْمُرُ بِالْعَدْلِ وَ الْاِحْسَانِ

اب ان کو خیال آتا ہے کہ ہاں بھئی! اب ٹائم آگیا ہے پہنچنے کا، اس وقت نکلتے ہیں۔ جب امام تکبیر کہہ رہا ہوتا ہے ''اللہ اکبر'' اس وقت مسجد میں داخل ہوتے ہیں اور امام صاحب کے سلام پھیرنے کے بعد سب سے پہلے مسجد سے نکلنے والے یہ ہوتے ہیں۔ یہ ہماری مسجد سے محبت ہے۔

شہر کا ''ڈی سی او'' مسجد کا مزدور:

وسط ایشیا میں ایک جگہ ایک مسجد بن رہی تھی، تو ہم وہاں نماز پڑھنے کے لیے چلے گئے۔ ایک صاحب کو دیکھا کہ انہوں نے سیمنٹ کی تغاری سر پر رکھی ہوئی اور آ جا رہے تھے۔ ہم نے آگے کسی شہر میں جانا تھا اور لوگوں سے اس کی ڈائریکشن لینے کی کوشش کر رہے تھے کیونکہ وہاں کے لوگ انگریزی نہیں جانتے تھے۔ رشین لوگ رشین ہی جانتے ہیں، اس کے علاوہ انہیں اور کوئی زبان نہیں آتی۔ ہم تو اشاروں کی زبان میں سمجھتے تھے۔ ایک صاحب سے اشاروں کی زبان میں پوچھ رہے تھے کہ ہم نے فلاں جگہ جانا ہے تو کیسے جائیں؟ تو وہ جو مزدور تغاری سر پر رکھے ہوئے تھا آیا اور وہاں کھڑا ہوگیا، تغاری اس نے نیچے رکھی اور ہم سے انگریزی میں بات شروع کر دی۔ ہم تو بڑے خوش ہوئے کہ چلو کوئی بندہ تو ایسی زبان میں بات کر رہا ہے جو ہم بھی سمجھتے ہیں۔ اس نے ہمیں تفصیل سے سمجھایا کہ آپ نے کہاں اور کیسے جانا ہے؟ ہمیں حیرت ہوئی کہ یہ مزدور سا آدمی انگریزی کیسے فرفر بولتا ہے۔ جب اس سے پوچھا تو

اس نے کہا کہ میں اس محلے کا باشندہ ہوں، ہمارے یہاں دستور ہے کہ جب یہاں مسجد بنتی ہے تو ہم مالی طور پر بھی اس میں حصہ لینا اپنا فرض سمجھتے ہیں اور Physicaly بھی اس میں اپنے جسم کو استعمال کرنا اپنا فرض سمجھتے ہیں کہ محبوب حقیقی کا گھر بن رہا ہے۔ کہنے لگا کہ میں پورے ڈسٹرکٹ کا ڈی سی او ہوں اور تین دن اپنے دفتر سے میں نے چھٹی کی ہے اور آ کر مسجد کے انجینئر کو کہہ دیا کہ میں تمہارے حکم کا منتظر ہوں جو کام ذمہ لگا دو۔ اس نے کہا کہ سیمنٹ کی تغاری اس جگہ سے دوسری جگہ لے کر جانی ہے، میں پچھلے دو دن سے سیمنٹ کی تغاریاں یہاں سے وہاں پہنچا رہا ہوں، اللہ کے گھر کی مزدوری کر رہا ہوں۔ تو محبت تو اسی کو کہتے ہیں نا کہ جہاں اللہ کا گھر بنے وہاں مالی حصہ بھی لیا جائے اور جانی حصہ بھی لیا جائے۔

گھر کا عبادت خانہ:

آج کل لوگ گھر بناتے ہیں تو جس سے محبت ہوتی ہے، اسے کہتے ہیں: جی! میں گھر بنا رہا ہوں، اس میں ایک کمرہ آپ کے لیے بھی بنایا ہے۔ مہمان کے لیے کمرہ، رشتہ دار کے لیے کمرہ، کسی خاص بندے کے لیے کمرہ۔ کہتے ہیں: جی آپ میرے گھر آئیں گے تو آپ کو مستقل ایک کمرہ ملے گا۔ تو کبھی سوچا کہ اللہ رب العزت کے لیے بھی ایک کمرہ بننا چاہیے۔ کتنے مسلمان ہیں جو آج کل گھر ڈیزائین کرتے ہوئے ایک کمرے کو اس لیے بنائیں کہ ہم اس میں عبادت کیا کریں گے۔ یہ گھر کی مسجد ہو گی۔ اس پر حکم تو مسجد کا نہیں ہوتا بس عبادت خانہ ہوتا ہے۔ پہلے ہمارے بزرگ جب گھر بناتے تھے تو ایک کمرہ اللہ کی عبادت کے لیے بنایا جاتا تھا۔ آج جب گھر بنواتے ہیں تو کہتے ہیں: یہ بیٹے کا کمرہ ہے...... یہ بیٹی کا...... یہ میاں بیوی کا کمرہ...... یہ گیسٹ روم اور پتہ نہیں کیا کیا...... بھئی! کوئی کمرہ تو عبادت کے لیے بھی ہونا چاہیے۔

بعض ملکوں کے مسلمانوں میں یہ خاص بات دیکھی ہے کہ ان کی آبادی میں جو مسلمان بھی اپنا گھر Plan (منصوبہ) کرتا ہے اس میں ایک کمرہ عبادت کے نام پر ضرور رکھتا ہے۔ اس میں قالین بچھا ہوا ہے، جائے نماز بچھی ہوئی ہیں، قرآنِ پاک موجود ہے، عورتوں کے نقاب رکھے ہوئے ہیں، تسبیح رکھی ہوئی ہے، رحل رکھے ہوئے ہیں۔ گھر کے بچے یا عورت جب کسی نے نماز پڑھنی ہوتی ہے تو وہ اپنے کمرے میں نہیں پڑھتے، اس مخصوص کمرے میں جا کر پڑھتے ہیں اور مسجد کے ماحول میں اس جگہ پڑھ کر واپس آ جاتے ہیں۔ آج ہم میں سے کتنے لوگ ہیں جنہوں نے گھر میں اللہ کی نسبت سے کسی کمرے کو مختص کر رکھا ہو کہ یہ میرے محبوب کے لیے ہے، میں یہاں اپنے محبوب سے ملاقات کیا کروں گا۔

گھروں کی بربادی کی وجہ:

تو مسجد سے ہمارا تعلق کتنا کمزور ہو گیا۔ اور یا درکھنا: Tit for Tat (ادلے کا بدلہ)۔ ہم اللہ کے گھر کو آباد کریں گے اس کے نتیجے میں اللہ ہمارے گھروں کو آباد کریں گے۔ آج گھر کیوں برباد ہیں؟ کیوں میاں بیوی میں لڑائیاں ہیں؟ کیوں اولاد اور والدین کے درمیان میں Misunderstanding (غلط فہمیاں) ہیں۔ ہوتا گھر ہے، لیکن گھر کا ہر بندہ پریشان ہوتا ہے، دل چاہتا ہے گھر چھوڑ کر چلے جائیں۔ وجہ کیا ہے کہ ہم نے اللہ کے گھر کو آباد نہیں کیا۔ اللہ نے سب کچھ دے کر ہمارے گھر میں دل کا سکون نہیں دیا۔ آپ مسجد جانا شروع کر دیں، مسجد سے محبت کا اظہار کرنا شروع کر دیں، پھر دیکھنا کیسے سکون مل جاتا ہے۔ مسجد سے محبت کا اظہار کرنا یہ ضروری ہے۔

مسجد بنانے پر جنت میں گھر کا وعدہ:

اللہ رب العزت نے اپنے حبیب ﷺ کے ذریعے ایک بات بتا دی، سادہ سی بات ہے مگر سمجھ میں آجائے تو بڑی بات ہے۔

نبی علیہ الصلوٰۃ والسلام نے فرمایا:

((مَنْ بَنٰی لِلّٰہِ مَسْجِدًا بَنَی اللّٰہُ لَہٗ بَیْتًا فِی الْجَنَّۃِ))

(کنز العمال: ۲۰۷۸۰)

''جو اللہ کے لیے مسجد بنائے گا، اللہ اس کے لیے جنت میں گھر بنائے گا''

اب یہ ایک طرح سے Dealing ہے، اللہ اس بندے سے Agreement (وعدہ) فرما رہے ہیں۔ جو دنیا میں میرا گھر بنائے گا میں اس کے لیے جنت میں گھر بناؤں گا۔ علما نے لکھا ہے کہ ہر بندہ تو پورا گھر نہیں بنا سکتا، البتہ جتنی استطاعت ہے اتنا تم مسجد میں لگا دو، تم اپنی استطاعت کے مطابق خرچ کرو گے، اللہ تمہیں اپنی شان کے مطابق اجر دے دیں گے۔ ایک اینٹ بھی لگا دو گے جب تک وہ لگی رہے گی عبادت کا ثواب تمہارے نامۂ اعمال میں بھی لکھا جائے گا۔

راہِ خدا میں خرچ کرنے کی برکت:

نبی علیہ الصلوٰۃ والسلام نے قسم کھا کر فرمایا کہ جو شخص اللہ کے راستے میں خرچ کرتا ہے، اللہ تعالیٰ اس کے مال میں کمی نہیں ہونے دیتے (ترمذی، رقم: ۲۳۲۵)۔ ویسے ہی فرما دیتے تو صادق اور امین کی بات تو صحیح ہوتی، لیکن قسم کھا کر فرمایا کہ جو اللہ کے راہ میں مال خرچ کرتا ہے اس کے مال میں کمی نہیں ہوسکتی۔ اچھا بتائیں آج تک آپ نے کوئی بندہ ایسا دیکھا ہے کہ اس نے مسجدیں بنوائی ہوں اور وہ بینکرپٹ (دیوالیہ) ہو گیا ہو۔

سینکڑوں لوگ موجود ہیں کسی نے کوئی ایسا بندہ دیکھا ہو کہ اس نے مسجدیں بنوائیں، مدرسے بنوائے، لوگوں کے لیے رفاہِ عامہ کے کام کیے اور وہ بینکرپٹ ہو گیا۔ کوئی نہیں دیکھا ہوگا۔ سود والوں کو تو بینکرپٹ ہوتے دیکھا ہوگا، کارخانہ داروں کو بینکرپٹ ہوتے دیکھا ہوگا، تاجروں کو دیوالیہ ہوتے دیکھا ہوگا، یہ وہ لوگ تھے جو اپنا گھر تو بناتے تھے، انہیں خدا کا گھر بنانا یاد نہیں تھا۔ یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ جو اللہ کا گھر بنائے اللہ اس کے گھر کو اجاڑیں۔ جس بندے میں تھوڑی سی بھی شرافتِ نفس ہو وہ ایسے معاملے کو پسند نہیں کرتا اللہ تعالیٰ تو احکم الحاکمین ہیں۔ اس لیے جو دنیا میں اللہ کا گھر بنائے گا اللہ تعالیٰ جنت میں اس کے لیے گھر بنائیں گے۔

حضرت عبدالمالک صدیقی رحمۃ اللہ علیہ کی مسجد سے محبت:

ہمارے دادا پیر حضرت عبدالمالک صدیقی رحمۃ اللہ علیہ نے خانیوال میں ایک مسجد بنوائی۔ ماشاء اللہ بہت بڑی مسجد اور اونچا مینار بنوایا۔ جب مسجد بن رہی تھی تو حضرت چندہ نہیں کرتے تھے جو جس کے دل میں آتا وہ خود ہی آ کر ڈال دیتا تھا۔ تو لوگوں میں مسجد کا نام ہی ''بے چندہ مسجد'' مشہور ہو گیا۔ **Sixteies** (ساٹھ کے عشرے) کی یہ بات ہے۔ اس زمانے میں چپس نئی نئی آئی تھی اور بہت کم گھروں میں استعمال ہوتی تھی۔ اس سے پہلے صرف سیمنٹ کا پلستر ہوتا تھا۔ کسی نے حضرت کو بتایا کہ حضرت! وہ ایک نئی چپس آئی ہے، اور کہیں کہیں بڑے وزیروں اور امیروں کے گھروں میں اس کے فرش بنتے ہیں، مگر اس کا فائدہ یہ ہے کہ اس کی **Maintenance** (مرمت) نہیں کرنی پڑتی۔ حضرت نے فرمایا کہ بہت اچھا، میں اس مسجد کے فرش پر بھی چپس لگواؤں گا اور دیواروں اور ستونوں پر بھی فرش لگواؤں گا۔ چنانچہ دیواروں پر چھت تک حضرت نے چپس لگوائی۔ فرماتے تھے کہ میں نے ایسی مسجد بنا دی ہے کہ بعد

والوں کو اس کی Maintenance (مرمت) کی ضرورت پیش نہ آئے۔ اور واقعی آج بھی اس مسجد میں جا کر دیکھو تو چھت تک چپس لگی ہوئی ہے حالانکہ پوری دیوار پر کون چپس لگاتا ہے؟ زیادہ سے زیادہ بھی کوئی لگائے تو چار فٹ تک لگاتا ہے، لیکن وہاں تو پوری دیوار چپس کی، تو یہ اللہ کی محبت تھی۔

تعمیرِ مسجد میں غیبی مدد:

حضرت رحمۃ اللہ علیہ نے مزدوروں سے یہ کہا ہوا تھا کہ آپ کام کرتے رہیں، ہمیں اللہ دے گا، ہم آپ کی خدمت کرتے رہیں گے۔ ایک مرتبہ ادائیگی میں کچھ دیر ہوگئی اور عید بالکل قریب تھی۔ حضرت کے دل میں اب یہی فکر کہ عید کے دن قریب ہیں، لوگوں کی ضروریات ہیں، بچوں کی ضرورتیں ہوتی ہیں، تو میں ان کو پیسے دوں۔ فرماتے ہیں کہ میں اللہ سے مانگتا تھا، ایک دن ایک بندہ ملنے کے لیے آیا اور جاتے ہوئے کہنے لگا: حضرت! میں یہ بریف کیس آپ کے لیے ہدیہ لایا ہوں۔ میں نے کہا: ادھر ہی رکھ دیجیے، اس نے رکھ دیا اور چلا گیا۔ ایک بچہ آیا میں نے اسے کہا کہ یہ بریف کیس گھر پہنچا دو، وہ گھر پہنچ گیا۔ جب میں گھر گیا تو گھر والوں نے پوچھا کہ وہ بریف کیس آیا تھا، وہ کہاں رکھنا ہے؟ میں نے کہا: اوپر کہیں رکھ دو، انہوں نے اوپر رکھ دیا۔ ایک دن، دو دن، ہفتہ گزر گیا۔ ایک دن کھانا کھاتے ہوئے بیوی نے کہا: وہ جو آپ نے بریف کیس اوپر رکھوایا تھا وہ لوہے کا بنا ہوا ہے؟ کہا: نہیں۔ کہنے لگی: وہ اتنا بھاری بریف کیس تھا۔ حضرت فرمانے لگے: اچھا اتارو اسے دیکھتے ہیں۔ جب اسے اتار کر کھولا تو ماشاء اللہ اس میں نوٹوں کی گڈیاں پڑی ہوئی تھیں۔ اب جب ان کو گنا تو پورے بارہ ہزار نکلے، یہ اتنے ہی پیسے تھے جتنے مستری اور مزدوروں کو دینے تھے۔ حضرت نے فرمایا کہ عید سے پہلے میں نے سب مستری مزدوروں کو اجرتیں دے کر

اللہ کا شکر ادا کیا۔ تو اللہ مدد بھی فرماتے ہیں۔

تین کاموں میں اللہ تعالیٰ کی مدد:

تین کام ایسے ہیں جن میں بندے کے ساتھ اللہ کی مدد لازمی شامل ہوتی ہے۔

ایک وہ آدمی جو گناہوں سے توبہ کرتا ہے اور اللہ سے دعا کرتا ہے، اے اللہ! مجھے اپنے گناہوں سے بچالے۔ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں اب اس بندے کو بچانا میرے اوپر لازم ہوگیا۔

دوسرا وہ شخص جو بچی کے نکاح کی تاریخ رکھ دے۔ ذرا بھی اسباب نہ ہوں، اللہ کو یہ عمل اتنا محبوب ہے کہ اللہ تعالیٰ اس بندے کو کبھی رسوا نہیں ہونے دیتے، ہمیشہ بیٹی اپنے گھر سے عزتوں کے ساتھ رخصت ہوتی ہے۔

اور تیسرا وہ شخص جو مسجد بنانے کی نیت کرلے تو اللہ تعالیٰ اسے کبھی ناکام نہیں کرتے اور ایسے اسباب بنا دیتے ہیں کہ مسجد بن جاتی ہے۔

غیبی نصرت کا عجیب واقعہ:

چنانچہ ایک مرتبہ جہانیاں شہر میں اس عاجز نے اسی عنوان کے تحت بیان کرتے ہوئے یہ تینوں باتیں بتا دیں اور واپس آگیا۔ ایک ہفتہ کے بعد مجھے وہاں کے ایک مقتدی صاحب کا فون آیا، کہنے لگے: حضرت جی! آپ تو بات بتا کر چلے گئے ہمارے لیے مصیبت کھڑی کردی، میں نے پوچھا کہ اللہ خیر کرے کیا ہوا؟ کہنے لگے: آپ جب مسجد سے نکل کر گئے تو ہمارے جو مولانا صاحب تھے انہوں نے مزدور لگا کر مسجد ہی شہید کروادی۔ ہم شام کو آئے تو ہم نے پوچھا: مولانا! مسجد گرادی۔ کہنے لگے: نیت کرلی ہے، بڑی اور نئی بنانی ہے۔ میں نے کہا: آگے سردیاں آرہی ہیں،

آپ کے پاس کوئی پیسہ، کوئی جمع شدہ رقم ہے؟ کہنے لگے نہیں۔ اب سارے نمازی پریشان۔ جب ان کو بٹھا کر بات کی تو کہنے لگے: پیر صاحب نے تقریر کی تھی، جو مسجد کی نیت کر لیتا ہے اللہ مدد کرتا ہے، لہٰذا میں نے مسجد گرا دی۔ اب محلے والوں نے مجھے فون کیا کہ یہ آپ کیسی بات کر کے چلے گئے؟ میں نے کہا: بات تو جو میں نے کی وہ سچی کی، اب آگے اللہ مدد کریں گے۔

ایک ہفتہ گزرا، دوسرا ہفتہ گزرا، تیسرا گزرا، ایک مہینہ گزر گیا، بنیادیں کھودنے کے پیسے نہیں ہو رہے۔ اب مولانا صاحب پر پریشر بڑھنا شروع ہو گیا۔ کہتے ہیں کہ میں نے دو رکعت پڑھ کر اللہ سے مانگنا شروع کر دیا۔ اللہ! تیرے بندے کی بتائی ہوئی بات ہے اور میں نے یقین کر کے قدم اٹھایا ہے، تو لاج رکھ لے۔ کہنے لگے: اگلے دن میرے پاس ایک بندہ آیا، کہنے لگا: مولانا! مسجد بنانی ہے؟ جی ہاں بنانی ہے۔ کتنی بڑی مسجد بنانی ہے؟ جی اتنی بڑی بنانی ہے۔ کہنے لگے: کیا میں اس میں حصہ ڈال سکتا ہوں؟ میں نے کہا: ضرور ڈالیں۔ اس نے کہا: میری ایک شرط ہے۔ وہ یہ کہ ایک تو میرے نام کا کسی کو پتہ نہ چلے، آپ بتائیں گے ہی نہیں کہ کس نے بنوائی ہے اور دوسرا اس میں آپ نے کسی سے پیسے نہیں لینے۔ مولانا صاحب نے کہا: بہت اچھا۔ اللہ کی شان اس بندے نے تین مہینے کے اندر کھلی بڑی فل ماربل کے ساتھ مسجد بنوا دی، اکیلے بندے نے۔ اب جب مسجد بن گئی تو ان مولانا صاحب نے فون کیا، حضرت! آپ نے امتحان میں تو ڈالا تھا مگر اللہ تعالیٰ نے مسجد بنوا دی، اب جمعہ کا افتتاح بھی آپ نے آ کر کرنا ہے۔

اللہ کی کوٹھی:

واقعہ سنانے کا مقصد یہ کہ ہم نے اپنی آنکھوں سے اس بات کی حقانیت کو دیکھا

ہے اور اس کو آزمایا ہے۔ ہمیں نیت کا پھل ملتا ہے۔ اپنا گھر بنانے کے اللہ تعالیٰ اسباب بھی خود بنا دیتے ہیں۔ ہاں یہ سعادت ہوتی ہے لوگوں کی، جس کو اللہ موقع نصیب فرما دیں۔

ہمارے حضرت مرشدِ عالم رحمۃ اللہ علیہ نے چکوال میں مسجد بنوائی، اتنی خوبصورت کہ پورے شہر میں کوئی اور بلڈنگ ایسی نہیں تھی۔ جب مسجد بن رہی ہوتی تھی تو حضرت صحن میں چارپائی ڈال کر بیٹھ جاتے تھے، مسجد کو دیکھتے رہتے تھے۔ ایک دن مجھے بلایا اور فرمانے لگے: دیکھو! لوگ اللہ کا گھر بناتے ہیں اور میں نے اللہ کی کوٹھی بنائی ہے۔ اللہ اکبر! اللہ یہاں بھی اپنی کوٹھی بنانا آسان فرما دے۔

﴿وَاٰخِرُ دَعْوٰنَا اَنِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ﴾

﴿لَقَدْ خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ فِیْ كَبَدٍ﴾ (بلد:۴)

پانچ انمول باتیں

بیان: محبوب العلما والصلحا، زبدۃ السالکین، سراج العارفین
حضرت مولانا پیر ذوالفقار احمد نقشبندی مجددی دامت برکاتہم

تاریخ: 13 جنوری 2012ء بروز جمعہ، ۱۹ صفر ۱۴۳۳ھ

موقع: بیان جمعۃ المبارک

مقام: جامع مسجد زینب معہد الفقیر الاسلامی جھنگ

اقتباس

جس انسان کے دل میں مال کی محبت ہو

یا تو وہ خود شہوات کے ذریعے مال کو برباد کر دیتا ہے۔

ورنہ اولاد ایسی ملتی ہے کہ وہ اس کا مال برباد کر دیتی ہے......

اس کا مال اکثر اینٹ گارے میں ضائع ہو جاتا ہے، محلات بنتے ہیں۔ کروڑوں روپیہ اینٹ گارے میں لگ جاتا ہے...... یا پھر اس پر ایسا ظالم حکمران مسلط ہو جاتا ہے جو اس کے مال کو چھین لیتا ہے...... یا پھر اس طرح بیمار ہوتا ہے کہ وہ مال سے لذت نہیں حاصل کر پاتا...... یا پھر اس کا مال ایسی جگہ پر لگتا ہے کہ جہاں سے واپسی ممکن ہی نہیں ہوتی۔ کاروبار میں ڈالا، پیسہ ڈوب گیا، کروڑ پتیوں کے کروڑوں ڈوبتے ہیں۔ تو مال کی محبت کا انجام بالآخر برا ہی ہوتا ہے۔

(حضرت مولانا پیر ذوالفقار احمد نقشبندی مجددی مدظلہ)

پانچ انمول باتیں

اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ وَکَفٰی وَسَلَامٌ عَلٰی عِبَادِہِ الَّذِیْنَ اصْطَفٰی اَمَّا بَعْدُ:
فَاَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنَ الشَّیْطٰنِ الرَّجِیْمِ ○ بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ ○
﴿لَقَدْ خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ فِیْ کَبَدٍ﴾ (بلد:۴)
سُبْحَانَ رَبِّکَ رَبِّ الْعِزَّۃِ عَمَّا یَصِفُوْنَ ○ وَسَلَامٌ عَلَی الْمُرْسَلِیْنَ ○
وَالْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ ○
اَللّٰھُمَّ صَلِّ عَلٰی سَیِّدِنَا مُحَمَّدٍ وَّعَلٰی اٰلِ سَیِّدِنَا مُحَمَّدٍ وَّبَارِکْ وَسَلِّمْ

دنیا مشقت کی جگہ ہے:

﴿لَقَدْ خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ فِیْ کَبَدٍ﴾ (بلد:۴)
''تحقیق ہم نے انسان کو مشقت کے لیے پیدا کیا ہے''

انسانی زندگی کا مقصد دنیا میں محنت کرنا، عمل کرنا، اللہ رب العزت کو راضی کرنے کے لیے اپنی ہمت کو صرف کرنا ہے۔ اس لیے مشائخ نے کہا کہ دنیا کام کی جگہ ہے، قبر آرام کی جگہ ہے اور جنت انعام کی جگہ ہے۔ جو دنیا میں کام کرے گا وہ جنت میں انعام پائے گا۔

اس کی مثال یوں سمجھیے کہ جیسے ایک فوجی، فوج کے اندر جب نوکری کے لیے جاتا ہے تو اس کا مقصد ہی مشقتیں اٹھانا ہوتا ہے، اس کو اپنے جسم کے اوپر مشقتیں اٹھانی

پڑتی ہیں، محنت کرنی پڑتی ہے، ایکسر سائزز ہوتی ہیں، حتیٰ کہ اپنی جان بھی فدا کرنی پڑتی ہے۔اسی طرح انسان دنیا میں آیا ہی مشقت اٹھانے کے لیے ہے۔اب اگر کوئی یہ کہے کہ مشقت آئی تو یہ کوئی حیرانی کی بات نہیں ہے، حیرانی کی بات یہ ہے کہ مشقت نہ آئے۔

انسان کا دھوکا:

عجیب بات تو یہ ہے کہ ہم میں سے ہر بندہ اس دنیا میں اپنی جنت سجانے میں لگا ہوا ہے۔ میرا گھر ایسا ہو، بیوی ایسی ہو، گاڑی ایسی ہو، بچے ایسے ہوں، کاروبار ایسا ہو، لمبی سوچیں ہوتی ہیں۔ اور اسے یہ پتہ نہیں ہوتا کہ موت اس کے زیادہ قریب ہے۔اللہ تعالیٰ نے تو بندوں کے لیے جنت آخرت میں بنائی اور ہم اسی دنیا میں جنت چاہتے ہیں۔ مطلب یہ کہ ہر چیز اپنی مرضی کی، اپنی دل پسند کی چاہتے ہیں۔ یہی اس دنیا کا دھوکا ہے کہ انسان کو یہ بات یاد نہیں ہوتی کہ موت ایک پل کی مانند ہے جو انسان کو آخرت سے ملاتی ہے۔

انسان کے دو فتنے:

اس دنیا میں دو چیزیں انسان کے لیے فتنہ ہیں۔

(۱) شہوات

(۲) شبہات

شہوات کی وجہ سے بھی انسان اللہ سے غافل ہو جاتا ہے اور شبہات کی وجہ سے بھی غافل ہو جاتا ہے۔

شہوات کی دو قسمیں

شہوات دو طرح کی ہیں۔

1 شہوتِ شکم:

ایک کو شہوتِ شکم کہتے ہیں یعنی کھانے پینے کی اشتہا۔ چنانچہ انسان کھانے میں حلال و حرام کا خیال ہی نہیں رکھتا۔ بس! اس کو مزیدار چیز کھانی ہے، اس کے اندر Contents (اجزائے ترکیبی) کیا ہیں؟ اس کا پتہ نہیں ہوتا۔ وہ کس پیسے سے خریدی؟ اس کا احساس نہیں ہوتا۔ اس کو فقط اپنا پیٹ بھرنے کی فکر ہے۔ اس کو شہوتِ شکم کہتے ہیں۔

2 شہوتِ فرج:

اور جب انسان کے اندر کھانے پینے کی یہ شہوت زیادہ ہو تو اس میں شہوتِ فرج بھی زیادہ ہوتی ہے۔ شہوت فرج ''جنسی خواہش'' کو کہتے ہیں۔ روزے رکھنے سے یہ شہوت کم ہوتی ہے اور پیٹ بھر کر کھانے سے یہ شہوت بڑھ جاتی ہے۔ حتی کی انسان بڑھاپے کی عمر کو چلا جاتا ہے، اسے آخرت یاد ہی نہیں ہوتی۔ اس کا جی چاہتا ہے کہ پھر کسی کنواری لڑکی سے میری شادی ہو جائے۔ وہ قبر کو بھول جاتا ہے، وہ اس بات کو بھول جاتا ہے کہ مجھے اللہ کے ہاں پیش ہونا ہے، اسے دنیا کی لذتیں یاد ہوتی ہیں۔ تو شہوتِ شکم کا انجام شہوتِ فرج ہوا کرتی ہے۔

غلبۂ شہوت کی بنیاد پیٹ بھر کر کھانا ہے:

اس لیے جو انسان چاہتے ہیں کہ ہماری نگاہ کنٹرول میں ہو، خیالات پاکیزہ

ہوں، تو ان کو چاہیے کہ وہ کم کھائیں۔ شریعت یہ تو نہیں کہتی کہ انسان کھانا پینا ہی چھوڑ دے، مگر یہ ضرور کہتی ہے کہ تم کم کھاؤ حتی کہ تمہارے اوپر شہوت غلبہ نہ کرے۔ کیونکہ ترتیب یہ ہے کہ جب انسان پیٹ بھر کر کھاتا ہے تو اس پر شہوت غالب آ جاتی ہے۔ آپ نے دیکھا ہوگا کہ پیٹ بھر کر کھانے سے نیند آتی ہے۔ یہ غفلت کی ایک قسم ہے اور انسان پیٹ بھر کر کھالیتا ہے تو اسے کوئی اور کام کرنے کو دل نہیں چاہتا۔ تو پیٹ بھر کر کھانے سے غفلت زیادہ اور غفلت زیادہ ہونے سے پھر شہوت زیادہ ہوتی ہے۔ جب انسان کے اندر شہوت زیادہ ہوگی تو پھر گناہ بھی زیادہ ہوں گے۔ جب گناہ زیادہ ہوں گے تو دل پر سیاہی بھی زیادہ ہوگی۔ جب دل سیاہ ہو جائے گا تو دل سخت بھی ہو جائے گا۔ اور یہی انسان کی بدبختی کی نشانی ہوتی ہے کہ اس کا دل سخت ہو جائے۔ تو کھانے کا تعلق انسان کے دل کی سختی کے ساتھ ہے۔

انسان کی اصل ضرورت تھوڑی ہے:

اللہ رب العزت نے انسان کے لیے جو ضرورت رکھی وہ بہت تھوڑی ہے۔ علما نے لکھا ہے کہ اگر کوئی بندہ ایک کھجور کھائے تو تین دن تک اسے بھوک کی وجہ سے موت نہیں آ سکتی۔ ایک کھجور کے اندر اتنی نیوٹریشن (غذائیت) ہوتی ہے۔ اس لیے ہمارے بعض بزرگ چند لقمے کھاتے تھے پورے دن کے اندر اور صحت کی زندگی گزارتے تھے۔ ہم لوگ عادتاً زیادہ کھانے کے عادی بن گئے ہیں۔ دو روٹی کھالینا تین روٹی کھالینا یہ ہماری عادت ہے۔ جسم کی ضرورت نہیں ہے۔

آپ کو معلوم ہونا چاہیے کہ ہم دن میں تین مرتبہ کھاتے ہیں، بعض جاندار ایسے بھی ہیں کہ جو روزانہ ایک دفعہ بھی نہیں کھاتے۔ چنانچہ ایک ایسی جگہ ہم گئے جہاں

لوگ شیروں کو پالتے تھے۔ انہوں نے بتایا کہ ہفتے میں ایک مرتبہ ہر اتوار کو اس کو گوشت ڈالتے ہیں۔ ہم نے پوچھا کہ کیا آپ کو گوشت مہنگا پڑتا ہے؟ کہنے لگے نہیں نہیں! اس کے کھانے کی ترتیب ہی یہی ہے کہ ہفتے میں ایک مرتبہ کھاتا ہے۔ تو جانور تو ہفتے میں ایک دفعہ کھائیں اور انسان ایک دن میں تین مرتبہ کھائے۔ اور تین کے علاوہ بھی، چائے کے ساتھ بسکٹ ہیں۔ جی! فلاں جگہ گئے تھے تو آئس کریم بھی کھالی، تو ہم بہت زیادہ کھانے کے عادی ہیں۔

زیادہ کھانے سے ذہنی صلاحیت کم ہوتی ہے:

جتنا زیادہ کھائیں گے اتنی ہی ذہنی صلاحیت کم ہوتی جائے گی۔ چنانچہ امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے تھے کہ میں نے صرف امام محمد رحمۃ اللہ علیہ کو دیکھا کہ جو موٹے بھی تھے اور عقلمند بھی تھے، ورنہ موٹے بندے کو میں نے عقلمند نہیں دیکھا۔ لگتا ہے جیسے جسم پر چربی چڑھتی ہے دماغ پر بھی چربی چڑھ جاتی ہے۔ تو جتنا انسان کم کھائے اتنا انسان کا دماغ بیدار رہتا ہے، وہ بیدار مغز ہوتا ہے، اس پر غفلت نہیں ہوتی۔

زیادہ کھانے سے دل سخت ہو جاتا ہے:

زیادہ کھانے سے انسان پر شہوت زیادہ ہوتی ہے اور خیالات پاکیزہ نہیں رہتے اور تناسب کے ساتھ کھائے تو انسان کے خیالات پاکیزہ رہتے ہیں۔ خیالات پاکیزہ نہیں رہتے تو دل سخت ہو جاتا ہے۔ جب دل سخت ہو جاتا ہے تو پھر انسان کا نیکی کرنے کو جی ہی نہیں چاہتا۔ نماز پڑھنے کا دل نہیں چاہتا، تلاوت کرنے کا دل نہیں چاہتا، حتیٰ کہ مسجد میں آنے کا دل نہیں چاہتا، نیک محفل میں آنے کو دل نہیں چاہتا۔ دل میں ایک بغض سا ہو جاتا ہے اور یہ بغض یہاں تک جاتا ہے کہ انسان کو دوسرے کی نیکی

بھی اچھی نہیں لگتی۔ کسی نے چہرے پر سنت سجا لی، اس کو تکلیف ہوتی ہے، کوئی نماز باقاعدگی سے پڑھتا ہے اس کو تکلیف ہوتی ہے۔کوئی مدرسے میں داخلہ لے لیتا ہے اس کو تکلیف ہوتی ہے۔فسق و فجور کی یہاں تک انتہا ہوتی ہے کہ دوسرے کی نیکی بھی بندے کو اچھی نہیں لگ رہی ہوتی ہے۔

دل کی نرمی کا ذریعہ......کم کھانا، حلال کھانا:

اگر ہم چاہتے ہیں کہ انسان کے دل میں رقت آئے نرمی آئے۔تو اس کا ایک علاج تو یہ ہے کہ ہم اپنے کھانے پر دھیان دیں۔ایک تو کم کھائیں اور دوسرا حلال اور پاکیزہ مال استعمال کریں۔مشتبہ چیزوں کا کھانا انسان کے دل کو غافل بنا دیتا ہے۔

زیادہ کھانے سے مال کی محبت پیدا ہوتی ہے:

اور جب زیادہ کھاتا ہے تو پھر مال کی محبت بھی دل میں زیادہ آتی ہے۔اس لیے آج کے دور کا بڑا فتنہ یہی ہے کہ ہر بندہ چاہتا ہے کہ میرے پاس ایک خزانہ ہونا چاہیے۔

﴿يٰلَيْتَ لَنَا مِثْلَ مَآ اُوْتِيَ قَارُوْنُ﴾ (القصص:۷۹)

''اے کاش! جتنا قارون کے پاس خزانہ تھا وہ میرے پاس بھی ہوتا۔''

مال کی محبت کا انجام:

ہمارے اکابر نے لکھا ہے کہ مال کی محبت کا انجام ہمیشہ برا ہوتا ہے۔کیوں کہ جس انسان کے دل میں مال کی محبت ہو، سب سے پہلی بات کہ اس کے دل میں ایسی

شہوت پیدا ہوتی ہے کہ وہ مال برباد کر دیتا ہے۔ چنانچہ کتنے لوگ ایسے ہیں کہ ان کو مال اللہ نے دیا اور ان کو شادیوں سے ہی فرصت نہیں ہوتی۔ اسی میں زندگی برباد ہو جاتی ہے، اسی میں عمر گزر جاتی ہے۔ اور جو شریعت کا خیال کرنے والے نہیں ہوتے، وہ بدکاریوں میں لگ جاتے ہیں اور اس میں مال ضائع کرتے ہیں۔ اور اگر انسان خود اپنا مال ضائع نہ کرے تو اس کا کوئی وارث ایسا بن جاتا ہے جو اس کے مال کو برباد کر دیتا ہے۔ چنانچہ ایسی مثالیں آنکھوں سے دیکھی گئی ہیں کہ آدمی نے مال جمع کیا اور اس کی اولاد نے مال کو پانی کی طرح بہا دیا۔

ایک جاگیردار کا عبرت انگیز واقعہ:

مشہور واقعہ ہے کہ ایک آدمی کی اتنی زمینیں تھیں کہ اس کی زمینوں میں ریلوے کے کئی اسٹیشن بنے ہوئے تھے۔ اور اس نے ایک دفعہ شہر کے چوک میں کھڑے ہو کر اپنے دوستوں سے کہا: ''تم پریشان رہتے ہو کہ آئے گا کہاں سے اور میں پریشان رہتا ہوں کہ لگاؤں گا کہاں پر''۔ اب اس کے تکبر کا یہ بول اللہ کو ناپسند آیا۔ نتیجہ کیا ہوا کہ بیمار ہوا اور چند دنوں کے بعد دنیا سے چلا گیا۔ اس کا ایک بیٹا تھا جس کی عمر ۱۸ سال تھی، وہ ساری جائیداد کا مالک بن گیا۔ جوانی کی عمر اور مال کی کثرت پھر برے لوگ اس کے دوست بن گئے۔ انہوں نے اس کو بدکاری کے کام پر لگا دیا۔ جوانی کی عمر تھی اس کو بھی اچھا لگتا...... روز رات کو نئے مہمان...... چنانچہ اس نے اپنا مال لٹانا شروع کر دیا۔ جب دو چار سال اس نے خوب جی بھر کر اپنی جوانی کو برباد کیا تو کسی نے اس کو بیرون ملک کا راستہ دکھا دیا۔ اب وہ باہر ملک جاتا اور کلبوں میں رات گزارتا، اور لاکھوں روپے صرف کرتا۔ ایک وقت آیا کہ بینک میں جتنا پیسہ تھا وہ سارے کا سارا

لگ گیا۔ پھر وہ آکر زمین کو بیچتا اور باہر کا چکر لگا آتا، پھر زمین بیچتا اور باہر کا چکر لگا آتا۔ حتی کہ چند سال گزرے تو اس نے اپنی ساری زمینیں بیچ دیں۔ وہ وقت بھی آیا کہ جس مکان میں رہتا تھا اس نے وہ مکان بھی بیچ دیا۔ پھر اس پر اس لڑکے پر ایسی حالت بھی آئی کہ جس چوک میں کھڑے ہوکر اس کے باپ نے تکبر کا بول بولا تھا۔ اسی چوک میں اس کا بیٹا کھڑے ہوکر اللہ کے نام کی بھیک مانگا کرتا تھا۔

مال کے مزید نقصانات:

جس انسان کے دل میں مال کی محبت ہو

...... یا تو وہ خود شہوات کے ذریعے مال کو برباد کر دیتا ہے۔

...... ورنہ اولاد ایسی ملتی ہے کہ وہ اس کا مال برباد کر دیتی ہے۔

...... اس کا مال اکثر اینٹ گارے میں ضائع ہو جاتا ہے، محلات بنتے ہیں۔ کروڑوں روپیہ اینٹ گارے میں لگ جاتا ہے۔

...... یا پھر اس پر ایسا ظالم حکمران مسلط ہو جاتا ہے جو اس کے مال کو چھین لیتا ہے۔

...... یا پھر اس طرح بیمار ہوتا ہے کہ وہ مال سے لذت نہیں حاصل کر پاتا۔

...... یا پھر اس کا مال ایسی جگہ پر لگتا ہے کہ جہاں سے واپسی ممکن ہی نہیں ہوتی۔ کاروبار میں ڈالا، پیسہ ڈوب گیا، کروڑ پتیوں کے کروڑوں ڈوبتے ہیں۔

تو مال کی محبت کا انجام بالآخر برا ہی ہوتا ہے۔

مال کا وبال:

اور یہ بھی یاد رکھیں کہ مال اکیلا نہیں آتا جب بھی آتا ہے وبال کو لے کر آتا ہے۔ تو ہمیں چاہیے کہ ہم اللہ تعالیٰ سے ایسا مال مانگیں جو وبال سے پاک ہو۔ کتنے لوگ

ہیں مال تو ان کو مل جاتا ہے لیکن اولاد نافرمان بن جاتی ہے، بیوی نافرمان بن جاتی ہے۔ گھر کے لوگوں سے بیماری نہیں جاتی۔ ایسے مال کو کیا کرنا ہے؟ مال وہ ہو جو سکون کا ذریعہ اور شریعت پر چلنے میں معاون بنے، ایسا مال اللہ سے مانگنا چاہیے۔

پانچ انمول باتیں

جب ذہن میں یہ ہو کہ یہ دنیا کی زندگی چندروزہ ہے تو پھر انسان اپنے مقصد کو نہیں بھولتا۔ چنانچہ حضرت حاجی امداداللہ مہاجر مکی رحمۃ اللہ علیہ کے کمرے میں ایک چارٹ لگا ہوا تھا اور اس پر پانچ باتیں لکھی ہوئی تھیں۔

پہلی بات

اِعْمَلْ لِدُنْيَاكَ بِقَدْرِ مَقَامِكَ فِيْهَا

(۱) دنیا کے لیے اتنی محنت کرو جتنا تمہیں یہاں رہنا ہے

پہلی بات یہ لکھی ہوئی تھی:

''دنیا کے لیے اتنی محنت کرو جتنا تمہیں یہاں رہنا ہے''

دنیا کی زندگی کتنی ہے؟ نبی علیہ الصلوٰۃ والسلام نے فرمایا کہ میری امت کی عمریں ((بَيْنَ سَبْعِيْنَ وَ سِتِّيْنَ)) ساٹھ اور ستر کے درمیان ہوں گی۔ ایسا بھی ہوگا کہ بچہ پیدا ہوتے ہی مرے گا اور ایسا بھی ہوگا کہ سو سال کا ہو کر مرے گا۔ لیکن اوسط نکالیں گے تو ساٹھ ستر کی Average (اوسط) ہوگی۔ تو ساٹھ ستر کی تو ٹوٹل عمر ہے، اس عمر کے لیے دن رات ہم لگے ہوتے ہیں۔ تو وہ فرماتے ہیں کہ دنیا کے لیے اتنی محنت کرو جتنا

تمہیں دنیا میں رہنا ہے۔

حضرت نوح علیہ السلام کی عمر:

سیدنا نوح علیہ السلام کی عمر نوسو پچاس سال تھی۔ جب ان کی وفات ہوئی تو اللہ رب العزت نے پوچھا: اے میرے نبی علیہ السلام! آپ نے دنیا کی زندگی کو کیسا پایا؟ تو انہوں نے جواب دیا: اللہ! یوں محسوس ہوتا تھا کہ جیسے ایک مکان کے دو دروازے ہیں، ایک سے داخل ہوا اور دوسرے سے باہر نکل آیا۔ نوسو پچاس سال کی زندگی کے بارے میں ان کے یہ Coments (الفاظ) ہیں تو ساٹھ ستر سال کی زندگی تو خواب ہی نظر آئے گی۔ اس میں سے بھی ہم میں سے کتنے ہیں جو آدھی سے زیادہ گزار چکے ہیں۔ اب ہم جیسے لوگ جو پچاس پچپن سے اوپر جا چکے، وہ تو اب ظہر عصر کا وقت گزار رہے ہیں اور ظہر عصر کے بعد مغرب ہوتے دیر نہیں لگا کرتی۔ اگر اس عمر میں بھی پہنچ کر انسان کی شہوتیں ختم نہ ہوں تو وہ تو پھر اپنی آخرت کو برباد ہی کر رہا ہے۔ تو فرمایا کہ دنیا کے لیے اتنی کوشش کرو جتنا تمہیں دنیا میں رہنا ہے۔ دنیا میں ہمیشہ تو کوئی نہیں رہے گا۔

شاہی محل کے دو عیب:

ایک بادشاہ نے محل بنوایا اور اعلان کروایا کہ جو اس میں سے عیب نکالے گا اسے انعام دیں گے۔ اتنا اس کو ناز تھا کہ ہم نے اتنا اچھا محل بنوایا۔ لوگ آ کر دیکھتے، ان کو کوئی عیب نظر ہی نہ آتا۔ ایک فقیر ادھر سے گزرا، اس نے کہا کہ مجھے اس میں عیب نظر آتے ہیں۔ لوگ پکڑ کر بادشاہ کے پاس لے آئے۔ بادشاہ نے پوچھا: تم کیا کہتے ہو؟ اس نے کہا: بادشاہ سلامت! اس میں دو عیب ہیں۔ پوچھا: کون کونسے؟ کہنے لگا: ایک

عیب تو یہ ہے کہ یہ محل ہمیشہ نہیں رہے گا اور دوسرا عیب یہ کہ تو اس میں ہمیشہ نہیں رہے گا۔ بات تو ٹھیک ہے کوئی ہمیشہ تو اس دنیا میں نہیں رہے گا، آخر اس نے جانا ہے۔

شداد کی عبرت انگیز موت:

نمرود نے اپنی جنت بنائی تو اس نے یہ دعا مانگی کہ اگر موت آئے تو ایسی کہ نہ دن ہو نہ رات ہو، نہ میں اندر ہوں نہ میں باہر ہوں، نہ میں اوپر ہوں نہ میں نیچے ہوں۔ اس کے ذہن میں یہ تھا کہ ایسی صورت تو کبھی ممکن ہی نہیں ہو سکتی، اللہ نے اس کی دعا قبول کر لی۔ چنانچہ اس نے باغِ ارم بنوایا۔ جب بن گیا تو وہ اپنے گھوڑے پر سوار ہوا اور باغ دیکھنے کے لیے چلا۔ اللہ کی شان کہ جب دروازے پر پہنچا تو پتہ چلا کہ دروازے کی اونچائی کم تھی، اور یہ گھوڑے پر بیٹھا ہوا تھا تو اس کا سر اونچا تھا۔ اب گزرنے کی صورت یہ تھی کہ نیچے اترتا تب اندر جا سکتا تھا۔ تو اس نے سوچا کہ نیچے اترنے کے بجائے میں بس ایک پاؤں گھوڑے سے نیچے کر کے گزر جاتا ہوں۔ چنانچہ گھوڑے کے اوپر بیٹھا ہوا تھا، اس نے ایک پاؤں ہٹایا اور ذرا نیچے ہوا۔ یعنی کیفیت یہ بنی کہ اوپر نہ نیچے اور گھوڑے کے دو پاؤں اندر تھے اور دو باہر (نہ اندر نہ باہر) اور ادھر سورج آدھا غروب اور آدھا طلوع تھا۔ اللہ نے اس وقت میں اس کو موت دے دی۔

موت سے انسان کیسے بچ سکتا ہے؟ دنیا میں لوگوں نے تاج محل بنائے...... چلے گئے۔ اہرامِ مصر بنائے، ہزاروں مزدوروں نے کام کیا، دنیا کا عجوبہ کہلاتا ہے، سب چلے گئے۔ کوئی بچا تو نہیں نا آخر، دنیا کی زندگی عارضی ہے بالآخر چلے جانا ہے، ہماری دنیا کی زندگی بالفرض سو سال کی ہو۔ آخرت کا ایک دن دنیا کے ستر ہزار سال کے

برابر ہے۔ اس ایک دن کے حساب سے اگر اندازہ لگائیں تو دنیا کی زندگی اڑھائی منٹ کی بنتی ہے، تو آخرت کے اعتبار سے ہم اڑھائی منٹ دنیا میں ہیں۔ اب اڑھائی منٹ کے لیے بندہ دنیا میں مستیاں کرے اور آخرت کے عذاب کو اپنے اوپر لے لے تو یہ کہاں کی عقلمندی ہے؟

اڑھائی منٹ کی زندگی:

پہلے وقتوں میں عمریں زیادہ ہوتی تھیں، جیسے حضرت نوح علیہ السلام کی زندگی تقریبا ایک ہزار سال تھی۔ اس زمانے میں ایک عورت نبی علیہ السلام کے پاس آئی اور کہنے لگی کہ حضرت! میری اولاد زندہ نہیں رہتی، بچپن میں ہی فوت ہو جاتی ہے، آپ دعا فرمائیں ان کی عمریں زیادہ ہو جائیں۔ بھئی! کتنی عمر میں فوت ہوتی ہے؟ حضرت! کوئی بچہ دو سو سال کا ہو کر فوت ہو جاتا ہے، کوئی تین سو سال کا ہو کر فوت ہو جاتا ہے۔ تو میری اولاد بچپن میں ہی فوت ہو جاتی ہے۔ وہ مسکرائے اور فرمانے لگے: اللہ کی بندی! ایک ایسا بھی وقت آئے گا جب انسانوں کی عمریں ہی سو سال سے کم ہوں گی۔ تو وہ حیران ہو کر کہنے لگی: اے اللہ کی نبی! جن لوگوں کی عمریں سو سال سے کم ہوں گی وہ رہنے کے لیے گھر بنائیں گے؟ انہوں نے فرمایا کہ ہاں گھر بنائیں گے، بیاہ شادیاں کریں گے۔ اس نے ٹھنڈی سانس لی۔ پوچھا کہ تو نے ٹھنڈی سانس کیوں لی؟ تو وہ کہنے لگی: میں اگر اس وقت ہوتی جب عمریں ہی سو سال سے کم ہوں گی تو اتنا وقت تو میں ایک سجدے میں ہی گزار دیتی۔

اتنی تھوڑی سی تو زندگی ہے۔ ہماری آنکھوں کے سامنے جنازے اٹھتے ہیں، گھر سے جنازے اٹھتے ہیں، ہمسائے سے اٹھتے ہیں، محلے سے اٹھتے ہیں، پھر بھی ہم اپنی

موت کو بھول جاتے ہیں۔تو فرمایا کہ ''دنیا کے لیے اتنی محنت کرو جتنا تمہیں دنیا میں رہنا ہے۔''

دوسری بات

وَ اعْمَلْ لِآخِرَتِكَ بِقَدْرِ لِقَائِكَ فِيهَا

آخرت کے لیے اتنی محنت کرو جتنا تم نے وہاں رہنا ہے

اور دوسری بات فرمائی:

''آخرت کے لیے اتنی محنت کرو جتنا تم نے وہاں رہنا ہے''

آخرت میں انسان کتنا رہے گا؟ ہمیشہ ہمیشہ رہے گا۔امام غزالی رحمۃ اللہ علیہ نے ایک اچھے انداز سے یہ بات فرمائی ہے۔ وہ فرماتے ہیں کہ اگر یہ زمین و آسمان کے درمیان جتنا خلا ہے، رائی کے دانوں سے بھر دیا جائے اور ایک پرندہ ہزار سال کے بعد آئے اور ایک دانہ اٹھائے، پھر ہزار سال کے بعد دوسرا دانہ اٹھائے، پھر ہزار سال کے بعد تیسرا دانہ اٹھائے، ایک وقت آئے گا کہ زمین اور آسمان کے درمیان جتنے دانے ہیں وہ ختم ہو جائیں گے لیکن آخرت کی زندگی کبھی ختم نہیں ہوگی۔تو جب ہم نے اتنا آخرت میں رہنا ہے تو پھر سوچیے کہ آخرت کے لیے انسان کو کتنی تیاری کرنے کی ضرورت ہے۔اس لیے نبی علیہ السلام نے فرمایا: اہلِ جنت کو کسی بات پر حسرت نہیں ہوگی سوائے ان لمحات کے جو دنیا میں انہوں نے غفلت کے اندر گزارے ہوں گے۔

جنت کے محلات کا خام مال:

ایک حدیث پاک میں ہے کہ انسان جب نیک اعمال کرتا ہے تو فرشتے اس کے

لیے جنت میں محل بنانا شروع کر دیتے ہیں۔ پھر کام روک دیتے ہیں، دوسرے فرشتے پوچھتے ہیں کہ تم نے کام کیوں روکا؟ یہ کہتے ہیں کہ ہمارے پاس Raw Materiel (خام مال) ختم ہو گیا ہے۔ چونکہ یہ بندہ پہلے عبادت کر رہا تھا، محل بن رہا تھا، عبادت ختم کر دی، محل بننا بند ہو گیا۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ ہم دنیا میں جو نیک اعمال کرتے ہیں ان کے بدلے میں اللہ آخرت میں ہماری جنت بنا رہے ہوتے ہیں۔ تو انسان کو چاہیے کہ خوب نیکی کرے، بھاگ بھاگ کر نیکی کرے، نیکی کرے اور تھک تھک کر پھر نیکی کرے تاکہ اللہ اس کے لیے آخرت کو اچھا بنا دے۔ جبکہ آج تو اگر کوئی آدمی آخرت کی تیاری میں لگا ہو تو لوگ کہتے ہیں: او جی! اس نے تو اپنی زندگی تباہ کر دی۔ حالانکہ آخرت تو اصل ہے، دنیا کی زندگی تو ڈھلتی چھاؤں ہے بالآخر چلی جائے گی۔

پوری زندگی تباہ:

ہم نے بچپن میں کتابوں میں ایک واقعہ پڑھا تھا۔ ایک ملک تھا جس میں کئی جزیرے تھے۔ ایک جزیرے پر آبادی تھی اور دور ایک اور جزیرہ تھا جہاں بچوں کا سکول تھا۔ بچے یہاں سے کشتی کے ذریعے اپنے سکول جاتے تھے۔ ایک دن بچوں کے دل میں شرارت آئی کہ اس بوڑھے ملاح کے ساتھ مذاق کریں۔ تو ان میں سے ایک نے ملاح سے پوچھا کہ آپ نے ''میتھ'' پڑھا ہوا ہے؟ اس نے کہا: نہیں، تو سب ہنسنے لگ گئے اور کہنے لگے کہ اگر آپ نے ''میتھ'' نہیں پڑھا تو آپ نے تو اپنی آدھی زندگی تباہ کر دی۔ پھر تھوڑی دیر کے بعد دوسرے کی باری آئی۔ اس نے پوچھا کہ بابا جی! آپ نے فزکس پڑھی ہے؟ اس نے کہا: نہیں، وہ پھر ہنسنے لگے۔ کہنے

لگے: اگر آپ نے ''فزکس'' نہیں پڑھی؟ تو آپ نے تو اپنی آدھی زندگی تباہ کر دی۔ پھر تھوڑی دیر بعد تیسرے کی باری آئی، اس نے کہا: کہ آپ نے کیمسٹری پڑھی ہے؟ ملاح نے کہا کہ نہیں، اس نے کہا: پھر تو آپ نے اپنی آدھی زندگی تباہ کر دی۔ اللہ کی شان، کچھ دیر بعد موسم تبدیل ہو گیا۔ بادل آ گئے ہوا چلنے لگی اور سمندر کے اندر لہریں چلنا شروع ہو گئیں اور کشتی ہچکولے کھانے لگ گئی۔ اب ملاح کی باری تھی۔ اس نے کہا: بچو! تم لوگوں کو تیرنا آتا ہے؟ بچوں نے کہا کہ تیرنا تو نہیں آتا۔ تو ملاح نے کہا: ''پھر تو تم نے اپنی ساری زندگی تباہ کر لی۔''

تو یہی حال ہے کہ آج دنیا دار لوگ کہتے ہیں کہ جو دین میں لگا ہوا ہے اس نے اپنی آدھی زندگی تباہ کر لی، لیکن جب ان کی موت کا وقت آئے گا تب حقیقت کھلے گی کہ ہم نے تو اپنی ساری زندگی تباہ کر لی۔

آخرت کی تیاری کرنے والے:

تو کتنی خوبصورت بات کہی کہ ''جتنا آخرت میں رہنا ہے اتنی آخرت کے لیے کوشش کر لو۔''

⊙...... ہمارے اکابر اتنی عبادت کرتے تھے کہ جب رات سونے کے لیے بستر پر جاتے تو تھکے ہوئے اونٹ کی طرح گھسٹ گھسٹ کر چل رہے ہوتے تھے۔

⊙......ایک بزرگ تھے کرز رحمۃ اللہ علیہ۔ ان کے حالاتِ زندگی میں لکھا ہے کہ ستر سال کی عمر میں وہ روزانہ ستر طواف کیا کرتے تھے۔ ستر طواف کا مطلب یہ ہے کہ ایک طواف کے سات چکر ہیں تو کل چار سو نوے چکر۔ یہ تقریباً بارہ تیرہ کلومیٹر کا سفر بنتا ہے۔ اور پھر ہر طواف کے دو نفل بھی۔ ستر ضرب دو ایک سو چالیس رکعت نفل ہو گئے۔ ذرا ایک

سو چالیس نفل پڑھ کر دیکھیں کہ حالت کیا ہوتی ہے؟ میں تو اپنے دوستوں کو کہا کرتا ہوں کہ ہم اگر کسی رات دس رکعت نفل پڑھ لیں تو دسویں رکعت میں رکوع سے اٹھتے ہوئے سَمِعَ اللّٰہ کے بجائے ''اوئی اللہ'' نکل رہا ہوتا ہے۔ یہ تو ہماری حالت ہے، وہ ایک سو چالیس رکعت نفل پڑھتے تھے، اور یہ ان کا ایک عمل تھا، باقی سارے اعمال اس کے علاوہ تھے۔

⊙...... نبی علیہ الصلوٰۃ والسلام رات کو اس قدر لمبا قیام فرماتے تھے کہ حدیث پاک میں آتا ہے:

((حَتّٰی تَوَرَّمَتْ قَدَمَاهُ)) (صحیح بخاری، رقم: ۴۴۵۹)

''حتیٰ کہ ان کے قدمین مبارک متورم ہو جاتے تھے''۔

⊙...... ہمارے بعض بزرگوں نے تو وقت اس قدر بچایا کہ انسان ان کے حالات سن کر حیران ہو جاتا ہے۔ چنانچہ ہمارے ایک بزرگ فرماتے ہیں کہ میں نے ایک بزرگ کو دیکھا کہ خشک ستو کھا رہے ہیں، میں نے ان سے کہا کہ حضرت! ان میں پانی ملا لیتے، تر کر لیتے، ذرا اچھے لگتے۔ تو فرمانے لگے: میں نے خشک ستو کھانے کا بھی اندازہ لگایا اور تر ستو کھانے کا بھی اندازہ لگایا۔ تر کر کے کھانے میں وقت زیادہ لگتا ہے، لہٰذا میں پچھلے بیس سال سے خشک ستو ہی کھا لیتا ہوں اور اس سے جو وقت بچتا ہے اس میں ستر دفعہ ''سبحان اللہ'' پڑھ لیتا ہوں۔ کھانے میں بھی اپنا وقت بچاتے تھے۔

⊙...... ایک بزرگ تھے، ان کو اگر کوئی کھانے کی دعوت دیتا تو وہ شرط لگاتے تھے کہ مجھے ایک کمرہ دے دینا، میں اس کمرے میں آ کر بیٹھ کر پڑھنا شروع کر دوں گا، جب تم دستر خواں پر کھانا لگا دو گے میں اٹھ کر کھانا کھاؤں گا اور واپس آ جاؤں گا۔

⊙......کئی ایسے اکابر بھی تھے راستہ چلتے ہوئے بھی کتاب پڑھتے جاتے تھے کہ یہ وقت بھی ہمارا ضائع نہ ہو۔

⊙......ایک بزرگ تھے حضرت مولانا حسین علی رحمۃ اللہ علیہ واں بھچراں والے۔ آخری عمر میں ان کی یہ کیفیت ہوگئی تھی کہ جو بندہ ان کو ملنے جاتا تھا، حال احوال پوچھنے کے بعد فرماتے تھے: اچھا بھئی! آپ نے بھی آخرت کی تیاری کرنی ہوگی اور مجھے بھی کرنی ہے، اچھا! پھر ملیں گے، السلام علیکم، بس اتنی بات کرتے تھے۔

⊙...... وسطِ ایشیا میں ایک جگہ ہمارا جانا ہوا۔ وہاں ایک بزرگ گزرے ہیں علاؤ الدین عطار رحمۃ اللہ علیہ، ان کا مصلی پڑا ہوتھا۔ عجیب بات یہ کہ وہ اتنی زیادہ نماز پڑھتے تھے اور زیادہ نماز پڑھنے کی وجہ سے گھٹنے پاؤں اور پیشانی کی جگہ پر سجدے کے نشان پڑ گئے تھے۔ اتنی تو نماز پڑھی ہوگی کہ پتھر پر نشان پڑ گئے۔ ؎

نشانِ سجود جبین پر ہوا تو کیا؟
کوئی ایسا سجدہ کر کہ زمیں پر نشاں رہے

تو جو وہاں کے سجادہ نشین تھے انہوں نے اجازت دی کہ اس پر نماز پڑھ لیجیے تو میں ان کے پاؤں پر پاؤں رکھ کر جو گہرے ہو گئے تھے، (جیسے مقام ابراہیم پر پاؤں کے نشانات ہیں) حیران ہو رہا تھا کہ یا اللہ! کتنی نماز پڑھی ہوگی کہ ان کے جسم کے اعضا کے نشان پتھر پر پڑ گئے!

تو جنہوں نے دنیا کی حقیقت کو پہچانا انہوں نے پھر دنیا میں آخرت کے لیے اس قدر محنت کی۔

تیسری بات

وَ اعْمَلْ لِلّٰهِ بِقَدْرِ حَاجَتِكَ اِلَيْهِ

اللہ کی رضا کے لیے اتنی محنت کرو جتنا تم اللہ کے محتاج ہو

تیسری بات یہ کہ اللہ کی رضا کے لیے اتنی محنت کرو جتنا تم اللہ کے محتاج ہو۔ تو بھئی! ہم تو اللہ کے بہت محتاج ہیں۔ اس لیے اللہ کی رضا حاصل کرنے کے لیے ہمیں بہت کوشش کرنی چاہیے۔ کہتے ہیں: ''رب راضی تے سارا جگ راضی'' جس بندے سے اللہ راضی ہو جاتے ہیں سارا جہاں اس سے راضی ہو جاتا ہے اور جس سے اللہ ناراض ہو جاتے ہیں ساری دنیا اس سے ناراض ہو جاتی ہے۔ ؎

یہ خزاں کی فصل کیا ہے فقط ان کی چشم پوشی
وہ اگر نگاہ کردیں تو ابھی بہار آئے

جب رحمت کی نظر ہٹ جاتی ہے تو بس انسان کی زندگی میں خزاں آ جاتی ہے۔ جب اللہ کی رحمت کی نظر ہو جاتی ہے تو بہار آ جاتی ہے۔

دریا میں رہنا اور مگر مچھ سے بیر:

دنیا کہتی ہے: ''دریا میں رہنا اور مگر مچھ سے بیر''۔ اس کا کیا مطلب؟ یہ کہ اگر دریا میں رہنا ہو تو مگر مچھ کے ساتھ بیر اچھا نہیں ہوتا۔ تو بھئی! دنیا میں رہنا اور دنیا بنانے والے سے بیر، یہ کیسے ہو سکتا ہے؟ تو ہمیں اللہ تعالیٰ کو راضی کرنے کے لیے اتنی کوشش کرنی چاہیے جتنا ہم اللہ کی رضا کے محتاج ہیں۔ جب اللہ تعالیٰ کسی بندے سے خفا ہوتے ہیں تو پھر اسے تنگی کا ناچ نچا دیتے ہیں۔ سونے کو بھی ہاتھ لگاتا ہے تو مٹی بن

جاتا ہے، ذلتیں ملتی ہیں، انسان گھر بیٹھے بٹھائے ذلیل ہو جاتا ہے۔

رضائے الٰہی کی پہچان:

ایک دفعہ بنی اسرائیل نے موسیٰ علیہ السلام سے سوال پوچھا:

حضرت! ہمیں کیسے پتہ چلے کہ اللہ تعالیٰ ہم سے راضی ہیں؟

حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اللہ تعالیٰ سے پوچھا کہ یا اللہ! قوم پوچھ رہی ہے ہمیں کیسے پتہ چلے کہ اللہ ہم سے راضی ہیں؟ تو رب کریم نے جواب میں فرمایا:

میرے پیارے موسیٰ! کام تو آسان ہے، ان لوگوں سے کہہ دیں کہ یہ اپنے دل میں جھانک کر دیکھیں، اگر یہ اپنے دل میں مجھ سے راضی ہیں، میں پروردگار ان سے راضی ہوں اور اگر اپنے دل میں یہ مجھ سے خفا ہیں تو میں ان سے خفا ہوں۔

آج کتنے لوگ ہیں جو اپنے حالات میں اللہ سے راضی نہیں ہوتے! شکوے ہوتے ہیں، ایسا نہ ہوا، یہ نہ ملا، یہ کیوں ہوا؟ اگر ہمارے دل میں شکوے ہیں تو اس کا مطلب کہ اللہ کے ہاں بھی ہمارا وہ مقام نہیں ہو سکتا۔

چوتھی بات

صرف اسی سے مانگو جو کسی کا محتاج نہیں

چوتھی بات لکھی ہوئی تھی: ''صرف اسی سے مانگو جو کسی کا محتاج نہیں''۔ تو بھئی! اللہ تعالیٰ ہی کی ذات ہے جو کسی کی محتاج نہیں، باقی تو سب کسی نہ کسی کے محتاج ہیں۔ تو محتاج سے کیا مانگنا؟

کہتے ہیں کہ ایک آدمی تھا، وہ اپنی کسی ضرورت کے لیے کسی بادشاہ کے

دروازے پر گیا۔تو وہاں کسی نے کہا کہ ذرا صبر کرو کہ بادشاہ سلامت نماز پڑھ رہے ہیں۔ وہ رک گیا۔تھوڑی دیر بعد پوچھا کہ بھئی! اب فارغ ہوئے؟ کہنے لگا: نہیں! ابھی وہ دعا مانگ رہے ہیں۔تو اس نے دل میں سوچا کہ جب بادشاہ بھی اللہ سے مانگ رہا ہے تو میں اس بادشاہ کے دروازے پر مانگنے کیوں آیا؟ مجھے چاہیے کہ میں بھی اللہ سے مانگوں۔تو وہ واپس لوٹ آیا۔

اکثر دیکھا ہے کہ جو لوگ مخلوق سے امیدیں لگاتے ہیں ان کی امیدیں ٹوٹ جاتی ہیں۔ برا وقت آنے پر کوئی ساتھ نہیں دیتا۔ الا ماشاء اللہ۔ جب وقت بدلتا ہے تو لوگوں کی نگاہیں بھی بدل جاتی ہیں۔اس لیے خوشیاں آتی ہیں تو تقسیم کرنے والے کئی ہوتے ہیں اور جب غم آتا ہے تو جھیلنے کے لیے انسان اکیلا ہوتا ہے۔تو فرمایا کہ صرف اسی سے مانگو جو کسی کا محتاج نہیں۔

پانچویں بات

وَاعْمَلْ لِلنَّارِ بِقَدْرِ صَبْرِكَ عَلَيْهَا

گناہ اتنا کرو جتنا کہ عذاب سہنے کی طاقت ہے

اور آخری بات فرمائی کہ گناہ اتنا کرو جتنا کہ عذاب سہنے کی طاقت ہے۔ہم میں تو عذاب سہنے کی طاقت بالکل ہی نہیں ...... ہم سے تو دھوپ کی گرمی برداشت نہیں ہوتی جہنم کی آگ کہاں برداشت ہوگی؟ دھوپ میں پسینہ بہے تو ہم سائے کی طرف بھاگتے ہیں۔ ذرا موسم گرم ہو ہم ایئر کنڈیشنڈ جگہ دیکھتے ہیں۔ جو اتنے نازک ہوں تو بھلا جہنم کی گرمی کون برداشت کرسکتا ہے؟

سب سے ہلکا عذاب:

قیامت کے دن جس بندے کو سب سے ہلکا عذاب ہوگا، حدیث پاک میں آتا ہے کہ اسے آگ کے بنے ہوئے دو جوتے پہنا دیے جائیں گے اور اس کی اتنی گرمی ہوگی کہ اس کا دماغ ہنڈیا کی طرح ابل رہا ہوگا۔ سوچیں! دو جوتے پہنانے کی گرمی اتنی ہوگی اور جس کو جہنم کی آگ میں ہی ڈال دیا جائے گا اس کا کیا حشر ہوگا!

تو فرمایا: اتنا گناہ کرو جتنا تم میں عذاب سہنے کی طاقت ہے۔ ہم سے تو دو بندوں کے سامنے بھی شرمندگی برداشت نہیں ہوتی کہ انہوں نے لوگوں کے سامنے مجھے ذلیل کیا اور قیامت کے دن تو ساری مخلوق ہوگی۔ ان کے سامنے انسان کے پول کھلیں گے، اس دن کی ذلت کون برداشت کر سکے گا۔

دنیا میں بھی عذاب:

اور یہ بھی ذہن میں رکھیں! جو انسان دنیا میں نافرمانی کرتا ہے آخرت میں تو عذاب ہوگا ہی، دنیا میں بھی نقد سزا ملتی ہے۔ نقد سزا یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ انسان کے دل کو بے سکون کر دیتے ہیں۔ جو بندہ گناہوں بھری زندگی گزارتا ہے اس کا دل بے سکون ہوتا ہے۔ ان امیروں، وزیروں کی زندگیوں کو ذرا قریب سے دیکھو! ایئر کنڈیشنڈ کمرے، لحاف لے کر لیٹے ہوتے ہیں، نیند نہیں آتی، پھر نیند کی گولیاں کھاتے ہیں۔

ہم نے ایک مرتبہ ایک مسجد کا لنٹر ڈالنا تھا، گرمی کا موسم تھا، ظہر کے وقت ہم نے ایک گھنٹہ کے لیے چھٹی دی کہ سب لوگ کھانا کھا لیں، نماز پڑھ کر ذرا آرام کر لیں۔ تو جب ہم اوپر سے نیچے اترے تو ہم نے دیکھا کہ کنکریٹ کا ڈھیر ہے اور ایک مزدور

کنکریٹ کے ڈھیر پر وہیں لیٹا سویا ہوا تھا۔ گرم کنکریٹ ...... جولائی کا مہینہ...... اتنا پسینہ اور کنکریٹ کے اوپر سویا ہوا! ہم اسے دیکھ کر حیران ہوئے۔ سبحان اللہ! ؎

کتنی تسکین وابستہ ہے تیرے نام کے ساتھ
نیند کانٹوں پہ بھی آ جاتی ہے آرام کے ساتھ

تو ایسے بھی لوگ ہیں کہ گرمی کے موسم میں کنکریٹ پر آرام سے سوئے ہوئے ہیں اور ایسے بھی ہیں کہ ایئر کنڈیشنڈ کمروں میں نیند نہیں آتی۔ اس کی وجہ کیا ہے کہ ان کے دل بے سکون ہوتے ہیں، دلوں سے سکون نکال لیا جاتا ہے اور ایک خوف دل میں ڈال دیا جاتا ہے۔

ایک کروڑ پتی صنعتکار کی بے سکونی:

چنانچہ ایک صاحب نے ایک دفعہ فون کیا۔ بڑے Industrialist (صنعتکار) تھے۔ رات کے تین بجے ان کا فون آیا۔ میں نے کہا: خیریت تو ہے آپ نے اس وقت فون کر دیا! کہنے لگے کہ میرے پاس اتنا مال پیسہ ہے کہ اگر میں حساب لگانے کا ارادہ کروں تو میرے اکاؤنٹ برانچ والوں کو ایک مہینہ چاہیے۔ جن کمپنیوں میں میرے شیئرز ہیں، میری انوسٹمنٹ ہے، اس کا حساب نکالنے میں ایک مہینہ چاہیے۔ اتنے پیسے ہیں۔ جو چاہتا ہوں کھاتا ہوں، جہاں چاہتا ہوں سوتا ہوں، پتہ نہیں کیا بات ہے؟ مجھے رات کو نیند نہیں آتی۔ تو میں نے کہا: جناب! آپ کے پاس مال اس سے دس گنا زیادہ بھی ہو جائے، آپ کو نیند نہیں آئے گی۔ اس لیے کہ جن کاموں سے نیند آنی تھی آپ کی زندگی ان کاموں سے خالی ہے۔ پھر میں نے ترغیب دی کہ آپ نماز پڑھا کریں، تلاوت کریں، نیکی کریں، یہ وہ چیزیں ہیں کہ جن سے

اللہ تعالیٰ آپ کے دل کو سکون عطا فرمائے گا۔

تو گناہوں کی ایک مصیبت یہ بھی ہے کہ اسی دنیا میں انسان کو اس کی سزا مل جاتی ہے۔

تکبّر کا عبرتناک انجام:

بات مکمل کرنے سے پہلے ایک فرسٹ کلاس گزٹڈ آفیسر کا واقعہ سنا دوں۔ ایک صاحب تھے اکیس بائیس گریڈ کے آفیسر تھے، کروڑوں پتی تھے، رشوت کا مال خوب جمع کیا تھا۔ اللہ کی شان! اس نے ایک جگہ پر کوٹھی بنائی اور اتفاق سے کوٹھی مسجد کے بالکل قریب تھی۔ جب وہ وہاں شفٹ ہوئے تو مؤذن نے حسبِ معمول صبح فجر کی اذان دی۔ جب سپیکر پر اذان ہوئی تو اسے بڑا غصہ آیا کہ مولوی صاحب نے میری نیند خراب کر دی۔ اگلے دن اس نے مؤذن کو بلوایا اور اس کو ڈانٹا کہ میں صبح سو رہا ہوتا ہوں اور تمہاری اذان سے میری نیند خراب ہوتی ہے۔ تم آج کے بعد اسپیکر پر اذان مت دیا کرو! وہ مؤذن بیچارہ...... اس نے لوگوں کو بتایا کہ میں فجر کی اذان تو اسپیکر پر نہیں دے سکتا، یہ صاحب منع کرتے ہیں۔ محلے کے جو بوڑھے تھے، کہنے لگے: بھئی! مسلمانوں کا ملک ہے، ہم بوڑھے لوگ تو گھڑی سے وقت بھی نہیں دیکھ سکتے، ہم تو اذان کے انتظار میں ہوتے ہیں کہ اذان کی آواز آئے تو ہم مسجد پہنچیں۔ اگر ان کو اذان بری لگتی ہے تو انہیں کہہ دو کہ یہ گھر کہیں اور بنالیں۔ مسجد کے ساتھ گھر کیوں بنایا؟

اگلے دن مؤذن نے پھر اذان دی، اسے بڑا غصہ آیا۔ اسی وقت اٹھ کر یہ بندہ مسجد میں آیا اور اس نے آکر مؤذن کو ایک تھپڑ لگایا...... تجھے میں نے کہا تھا کہ تو نے

اذان نہیں دینی تو نے کیوں اذان دی؟ بس اس کا یہ تکبر تھا کہ اللہ تعالیٰ کی اس پر پکڑ آ گئی۔ کیا ہوا کہ چند دنوں کے بعد اس پر فالج کا اٹیک ہوا اور اس کے دونوں ہاتھ سینے کے ساتھ لگ گئے۔ جب دونوں ہاتھ سینے کے ساتھ لگ گئے، تو دفتر سے چھٹی، نوکری سے فارغ کر دیا گیا۔ بہت پیسہ خرچ کیا مگر ٹھیک نہ ہوا، گھر آ گیا۔

اب اللہ تعالیٰ کی شان! کہ تھوڑے دنوں کے بعد دوسرا اٹیک ہوا اور اس کی جو نیچے کی ٹانگیں تھیں وہ بھی ساتھ لگ گئیں۔ دونوں ہاتھ دونوں ٹانگوں پر فالج...... یہ گوشت کا لوتھڑا...... زندہ لاش...... بیوی خدمت کرتی، بچے خدمت کرتے، مگر اس کا مزاج تو شاہانہ تھا، افسرانہ مزاج تھا۔ ذرا ذرا سی بات پر دوسروں کو گالیاں نکالنا اس کا معمول تھا۔ چنانچہ گھر میں بھی یہی سلسلہ...... بیوی سے ذرا کسی چیز کے لانے میں دیر ہوئی تو گالیاں نکالنی شروع کر دیں۔ اب بیوی بھی پریشان بچے بھی پریشان۔ بیوی نے ایک دن کہہ بھی دیا کہ دیکھیں! ہم چوبیس گھنٹے آپ کی خدمت میں لگے رہتے ہیں لیکن آپ پھر بھی مجھے بچوں کے سامنے گالیاں نکالتے ہیں، ذلیل کرتے ہیں، آپ ایسا نہ کیا کریں۔ اس نے اور زیادہ گالیاں نکالیں۔ جب گالیاں نکالیں تو بیوی کو غصہ آیا اس نے بچوں کو لیا اور میکے چلی گئی۔ اب اکیلا پڑا ہوا ہے۔

اب اس نے اپنے بھائی کو پیغام بھیجا کہ بھئی! بیوی مجھے چھوڑ کر چلی گئی ہے۔ آپ آئیں اور مجھے اپنے گھر لے جائیں، آپ بھائی ہیں، میری خدمت کریں۔ بھائی آیا اور اس کو گھر لے گیا۔ اب وہاں بھائی اور بھابی نے خدمت شروع کر دی۔ مگر پھر اس کا ان کے ساتھ بھی وہی رویہ۔ ذرا ذرا سی بات پر ڈانٹ ڈپٹ، غصہ...... تو ایک دن بھائی نے سمجھایا کہ بھئی! میری بیوی بچے تیرا اتنا خیال کر رہے ہیں، اتنی خدمت کر رہے ہیں اور تو ان کے ساتھ بجائے اس کے کہ محبت کرے الٹا ان کو ڈانٹ

ڈپٹ کرتا ہے۔اس نے بھائی کو بھی ڈانٹنا شروع کر دیا۔تو زن مرید بن گیا...... یہ ہو گیا اور وہ ہو گیا۔جب اس نے بھائی کو ڈانٹا تو اس کے بچوں کو غصہ آیا کہ ہمارے والد صاحب اس کا اتنا خیال کرتے ہیں اور یہ ہمارے والد صاحب کو ہمارے سامنے گالیاں نکالتا ہے۔انہوں نے چارپائی اٹھائی اور اس بندے کو اٹھا کر دروازے کے باہر سڑک کے کنارے ڈال دیا۔

پوری رات سڑک پر پڑا رہا...... کوئی اپنا نہیں ...... گھر ہے نہ در ہے۔جب صبح ہوئی، گرمی کا موسم تھا، زمین بھی تپنے لگی اور پسینہ بھی آنے لگا۔بھوک سخت لگی ہوئی تھی تو اس نے جو لوگ قریب آ جا رہے تھے، گزر رہے تھے، ان سے بھیک مانگنا شروع کر دی۔اللہ کے نام پر کوئی مجھے کھانا دے دے میں بہت بھوکا ہوں، میں نے کچھ نہیں کھایا۔ایک نوجوان آیا، اس نے دس روپے دیے۔اس نے کہا: میں پیسے کو کیا کروں گا؟ آپ کھانا لائیں اور مجھے کھلائیں۔اس نے کہا: میرے پاس تو وقت نہیں ہے، میں نے ٹائم پر کالج پہنچنا ہے، میں جا رہا ہوں۔ایک اور آدمی آیا، وہ اس کو پیسے دینے لگا، اِس نے کہا: مجھے تو روٹی چاہیے۔وہ گیا اور قریب ہوٹل سے روٹی لے کر آیا اور اسے کہا یہ کہ روٹی لے لو۔یہ کہنے لگا کہ بھئی! مجھے کھلاؤ! اس نے کہا: میرے پاس فرصت نہیں، میں نے دفتر پہنچنا ہے، یہ روٹی پڑی ہے۔اس نے کہا: نیچے نہ رکھو! مجھے پکڑا دو۔اب پکڑے کیسے؟ کیونکہ ہاتھ بھی سینے سے لگے ہوئے تھے اور پاؤں بھی یوں سینے کے قریب آ گئے تھے، تو پاؤں کے انگوٹھے اور انگلی کے درمیان اس نے روٹی پکڑی اور کتے کی طرح اس روٹی کو توڑ توڑ کر منہ سے کھانے لگا۔

جس کو مال کا اتنا نشہ تھا کہ اذان کے آنے سے اس کی نیند کھل جاتی تھی اور

مؤذن کو تھپڑ لگا کر کہتا تھا کہ تم نے اسپیکر پر کیوں اذان دی؟ آج اس کی یہ حالت ہے کہ اس کے دونوں ہاتھ مفلوج ہو چکے اور وہ اللہ کے نام پر بھیک مانگ کر کھا رہا ہے اور کتے کی طرح پاؤں میں روٹی کو پکڑ کر منہ سے نوچ نوچ کر کھا رہا ہے۔ اللہ اکبر کبیرا!

انسان جب دنیا میں تکبر کرتا ہے تو اس کی سزا دنیا میں مل کر رہتی ہے۔ اس لیے فرمایا کہ گناہ اتنا کرو جتنا تم میں عذاب سہنے کی طاقت ہے۔

حضرت مفتی محمد شفیع رحمۃ اللہ علیہ کا فرمان:

حضرت مفتی محمد شفیع رحمۃ اللہ علیہ فرمایا کرتے تھے:

''تم جتنا چاہو گناہ کرو اگر اللہ تعالیٰ نے تمہاری اسی زندگی کو جہنم کا نمونہ نہ بنا دیا تو میرا نام بدل دینا''

اور واقعی ایسا ہوتا ہے کہ جو انسان گناہوں میں لگتا ہے، وہ ایسا ہی کہتا ہے کہ اس جینے سے تو مر جانا اچھا تھا۔ تو یہ پانچ باتیں تھیں جو حضرت حاجی امداد اللہ مہاجر مکی کے کمرے میں انہوں نے لکھ کر لگائی ہوئی تھیں۔

آج وقت ہے:

لہٰذا آج کی اس محفل میں ہم اپنے اللہ رب العزت کے حضور یہ فریاد کرتے ہیں کہ اے کریم آقا! ہم پر نظرِ رحمت فرما دیجیے! ہمیں گناہوں کی ذلت سے بچا لیجیے! ہم تو دنیا میں دو بندوں کے سامنے ذلت برداشت نہیں کر سکتے، کل قیامت کے دن ساری مخلوق کے سامنے ذلت کیسے برداشت کریں گے؟ اسی لیے تو علامہ اقبال نے ایک شعر کہا تھا: ؎

تو غنی از ہر دو عالم من فقیر
روزِ محشر عذر ہائے من پذیر
گر تو می بینی حسابم ناگزیر
از نگاہِ مصطفیٰ پنہاں بگیر

''اللہ! تو دو عالم سے غنی ہے میں فقیر ہوں، اللہ قیامت کے دن میرے عذروں کو قبول کر لیجیے گا۔اور اگر آپ یہ فیصلہ کر لیں کہ میرا حساب لازمًا لینا ہے۔تو اے اللہ! نگاہِ مصطفیٰ سے پوشیدہ میرا حساب لے لینا۔''

میرے پلندے نبی ﷺ کے سامنے کھلیں گے کتنی شرمندگی ہوگی! آج وقت ہے ہم اپنے گناہوں سے سچی پکی توبہ کر لیں، اپنے اللہ سے اپنے گناہوں کو بخشوا لیں۔ پروردگارِ عالم دنیا و آخرت میں ہمیں اپنی حفاظت عطا فرمائے۔ (آمین ثم آمین)

﴿وَ اٰخِرُ دَعْوٰنَا اَنِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ﴾

حضرت مولانا پیر ذوالفقار احمد نقشبندی مدظلہ کی دیگر کتب

خطبات فقیر (اکتالیس جلدیں)

مجالس فقیر (آٹھ جلدیں)

مکتوبات فقیر

تصوف وسلوک

تصوف وسلوک (عربی)

عشق الٰہی

عشق رسول صلی اللہ علیہ وسلم

حیات حبیب

باادب بانصیب

لاہور سے تاخاک بخاراوسمرقند (سفرنامہ)

قرآن مجید کے ادبی اسرارورموز

نماز کے اسرارورموز

رہے سلامت تمہاری نسبت

حیاءاور پاکدامنی

دوائے دل

تمنائے دل

سکون دل

سکون خانہ
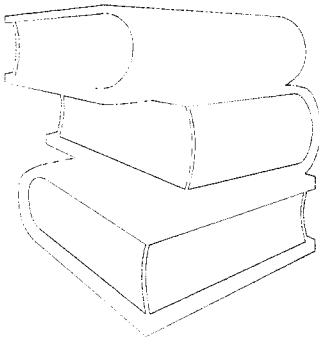
حضرت مولانا پیر ذوالفقار احمد نقشبندی مدظلہ کی دیگر کتب

حالات فقیر

سستی جنت

حضرت جی کا انداز تربیت (دو جلدیں)

معارف السلوک

عمل سے زندگی بنتی ہے

اہل دل کے تڑپا دینے والے واقعات (چار جلدیں)

مجالس فقیر (مبوب تین جلدیں)

مہلک روحانی امراض

گھریلو جھگڑوں سے نجات

مثالی ازدواجی زندگی کے رہنما اصول

اولاد کی تربیت کے سنہری اصول (دو جلدیں)

برکات رمضان

سوئے حرم

میں کہاں کہاں نہ پہنچا تیری دید کی طلب میں

محسنین اسلام

شرم وحیاء

ایمان کی اہمیت

علم نافع

زبدۃ السلوک

مغفرت کی شرطیں

کتنے بڑے ہیں حوصلے پروردگار کے

پریشانیوں کا حل

دعائیں قبول نہ ہونے کی وجوہات

یہ رشتہ ہمیشہ سلامت رہے گا

زلزلہ
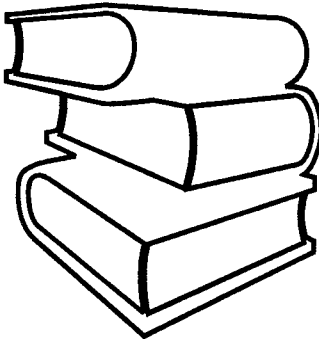
English Books

- **Love for Allah**
- **Love for Messanger ﷺ**
- **Be Courteous Be Blessed**
- **Wisdom For Seeker**
- **Traveling Across Central Asia**
- **How Great Is The Magnanimity Of Our Lord**
- **Ocean Of Wisdom**
- **Connections of Divinity**
- **Unblemished Youth**
- **Potions for the Heart**
- **Conqurer of the Heart**

مکتبۃ الفقیر 223 سنت پورہ فیصل آباد

مکتبۃ الفقیر کی کتب ملنے کے مراکز

معہد الفقیر الاسلامی ٹوبہ روڈ، بائی پاس جھنگ 0315-2402102

مکتبۃ الفقیر بالمقابل رنگون ہال، بہادر آباد کراچی 0345-2331357 (اعجاز)

دارالمطالعہ، نزد پرانی ٹینکی، حاصل پور 0300-7853059

مکتبہ سید احمد شہید لاہور اردو بازار 042-37228272

ادارہ اسلامیات، 190 انارکلی لاہور 042-37353255

مکتبہ رحمانیہ اردو بازار لاہور 042-37224228

مکتبہ امدادیہ ٹی بی ہسپتال روڈ ملتان 061-544965

مکتبہ دارالاخلاص قصہ خوانی بازار پشاور 091-2567539

دارالاشاعت، اردو بازار، کراچی 021-2213768

علمی کتاب گھر اوجا روڈ، اردو بازار، کراچی 021-32634097

حضرت مولانا گل رئیس صاحب، حضرت قاری سلیمان صاحب (مدظلہم) دارالہدیٰ بنوں

حضرت مولانا قاسم منصور صاحب ٹیپو مارکیٹ، مسجد اسامہ بن زید، اسلام آباد 0332-5426392

جامعۃ الصالحات، محبوب سٹریٹ، ڈھوک مستقیم روڈ، پیرودھائی موڑ پشاور روڈ، راولپنڈی 051-5462347

ادارہ تالیفات اشرفیہ فوارہ چوک ملتان 061-4540513 0322-6180738

مکتبہ سید احمد شہید جی ٹی روڈ اکوڑہ خٹک 0923-630964

ناشر

223 سنت پورہ فیصل آباد

041-2618003,0300-9652292